محمد اسرار مدنی

انڈونیشیا میں اسلام

تعبیر سے تعمیر تک

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور

اسلام آباد، پاکستان

'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور'(IRCRA) ایک غیر سیاسی، غیر سرکاری تحقیقی ادارہ اور تھنک ٹینک ہے جو تنازعات اور حلِ تنازعات سمیت سماجی ہم آہنگی ، امن کاری، جمہوریت، انسانی حقوق اور مذہبی سفارت کاری کے ذریعے پرامن بین الاقوامی تعلقات کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اس ادارے نے مسلم دنیا میں جمہوریت، مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے مسائل پر خاطرخواہ کام کیا ہے۔ حال ہی میں پاکستانی علما، سیاستدانوں اور سول سوسائٹی کا ایک وفد انڈونیشیا لے گئے اور وہاں کی مذہبی ، سماجی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں اور تبادلہ خیال کیاگیا۔ واپسی پر شرکا وفد نے اپنے خیالات کا اظہار مختلف کالمز، مضامین و مقالات کی شکل میں کیا، جسے ادارے کے سربراہ محمد اسرار مدنی نے کتابی شکل میں جمع کرکے پیش کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہوسکے کہ انڈونیشیا میں انتہاپسندی سے وسعت فکری تک، مذہب کی سیاسی تعبیر سے سماجی تعمیر تک کا سفر کیسے ممکن ہوا؟ اس کے تاریخی، مذہبی اور سماجی اسباب کیاتھے؟معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہورہے ہیں ؟ نیز، پاکستان سمیت خطے کے دیگر ممالک انڈونیشیا تجربات سے کیسے استفادہ کرسکتے ہیں؟

ایسے سوالات کے جوابات کے لیے کتاب پڑھیے اور اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ شکریہ

INTERNATIONAL RESEARCH COUNCIL FOR RELIGIOUS AFFAIRS (IRCRA)

DOWNLOAD FREE

ircra.org IRCRA ircra3 IRCRA3

انڈونیشیا میں اسلام

تعبیر سے تعمیر تک

ترتیب و تدوین

محمد اسرار مدنی

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور

اسلام آباد، پاکستان

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب: انڈونیشیا میں اسلام: تعبیر سے تعمیر تک

ترتیب وتدوین: محمد اسرار مدنی

نظر ثانی وپروف ریڈنگ: شفیق منصور

تزئین وسرورق: زِی گرافکس

تعاون: انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور (IRCRA)

تعداد: 1000

سال اشاعت: 2024ء

ایڈیشن: اوّل

مزید ایسے مضامین ومقالات کیلئے ہماری ویب سائٹ

www.tahqiqaat.pk

ملاحظہ فرمائیں

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور

یونٹ ۱۴، بلاک ۱۔ڈی، قائداعظم ایونیو، رحمت پلازہ، ڈی چوک، اسلام آباد، پاکستان

ٹیلی فون نمبر: 2726805 51 92+

کتاب حاصل کرنے کیلئے رابطہ نمبر: 9898998 315 92+

IRCRA وٹس ایپ: 0499995 311 92+

فہرست

پیش لفظ

محمد اسرار مدنی ..... ح

1. انڈونیشیا کی مذہبی جماعتوں کا شدت پسندی کے خلاف کردار

عبدالرحمان الواحد..... 1

2. اقلیت کا معاصر مفہوم اور جدید اجتہاد: انڈونیشیا کے تناظر میں جائزہ

احمد رجب برہانی، محمد نور پرابوو 9

3. مذہب وسیاست کے مابین تعلق: انڈونیشیا اور ملائشیا کا معتدل ماڈل

ڈاکٹر ماجدہ علی صالح..... 18

4. انڈونیشیا اور ملائشیا کے مذہبی ماڈل مختلف کیسے ہیں؟

شادی حامد 26

5. مذہبی سفارت کاری

خورشید ندیم 31

6. اسلام-رحمت اللعالمین: انڈونیشیا میں تعبیرِ دین کے اُصول

بیرسٹر ظفراللہ خان..... 35

7. دوسرا اسلام

خورشید ندیم 67

8. جی نہیں، اسلام ایک ہی ہے

ڈاکٹر حسین احمد پراچہ 71

9. انڈونیشیا کا اسلام

خورشید ندیم 75

10. مسجد یا سسٹم؟
خورشید ندیم 79
11. انڈونیشیا کے مذہبی ادارے اور قومی مرکزی دھارے میں ان کا کردار
محمد اسرار مدنی 83
12. کتاب: شرعی قوانین کے تناظر میں سماج سازی: آچے کا تجربہ
محمد اسرار مدنی 89
13. انڈونیشیا میں خواتین کی تعلیم: دورۂ انڈونیشیا کے کچھ مشاہدات
حیا حریم 93
14. کتاب: ملائیشیا اور انڈونیشیا میں ریاست، علماء اور اسلام کا باہمی ربط 99
15. سفر انڈونیشیا: مذہبی سفارتکاری..... 106
مولانا راشد الحق سمیع..... 106
انڈونیشیا وفد کے شرکاء 109
انڈونیشیا دورے سے کچھ تصاویر 110

پیش لفظ

کچھ عرصہ قبل پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب کے ساتھ ایک مشاورت کے دوران 'مذہبی سفارتکاری پروگرام' شروع کرنے کا خیال آیا تھا جس کی ڈاکٹر صاحب نے خوب حوصلہ افزائی کی۔اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس پر مزید سوچ بچار جاری رہی کہ اس کے خدوخال کیا ہوں گے اور اسے کس نہج پر آگے بڑھایا جائے۔جو خاکہ ذہن میں بناوہ یہ تھا کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوری ملک ہے، یہاں مذہبی عنصر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے،نہ صرف سماجی سطح پر، بلکہ کئی ریاستی امور بھی میں داخلہ وخارجہ سطح پر اس کالحاظ رکھا جاتا ہے۔حال ہی میں افغانستان کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں مذہبی علماء و قائدین کو شامل کرنا اس کی ایک ضمنی مثال ہے۔کئی مذہبی جماعتیں ملک کی مرکزی دھارے کی سیاست میں فعال ہیں اور ان کا کردار بہت مضبوط ہے۔اس کے علاوہ، پاکستان میں غیر سیاسی مذہبی تنظیموں اور رہنماؤں کو بھی عوام میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔یہ تو ملک میں مذہبی عنصر کی اہمیت وفعالیت کا پہلو ہے جو ظاہر ہے کہ اسے کئی ریاستی امور میں بھی ناگزیر بناتا ہے۔دوسری طرف پاکستان کے مذہبی طبقات کے حوالے سے کچھ ایسی چیزیں اور مسائل بھی ہیں جن پر مکالمے اور اصلاحات کی سخت ضرورت ہے۔اس کا ایک طریقہ تو براہ راست ان کے ساتھ نظری مکالمے کرنا اور بات چیت کرنا تھا کہ یہ مسائل ہیں اور ان پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔یہ منہج بھی مفید ہے اور اس پر بہت پہلے سے خود علماء کے داخلی ڈھانچے میں بھی کام ہو رہا ہے جو خوش آئند ہے۔جبکہ اس کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ پاکستان کے مذہبی طبقات چاہے وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی،ان کا دیگر مسلم دنیا میں موجود اس شعبے کے حلقے سے رابطہ قائم کرایا جائے، یا ایسی سہولیات پیدا کی جائیں کہ دیگر مسلم ممالک کے مذہبی حلقوں کے تجربات کا براہ راست مشاہدہ کیا جائے اور اس طرح مکالمے کی ایک راہ ہموار ہو۔ہمارے خیال میں یہ دوسرا طریقہ کافی مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم نے گزشتہ ایک برس کے دوران، افغانستان، چین اور انڈونیشیا کی سطح پر مذہبی سفارتکاری کے ضمن میں کچھ اقدام کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابھی حال ہی میں انڈونیشیا کی وزارت خارجہ کے تعاون کے ساتھ ہمارا ایک وفد وہاں گیا تھا جس میں ملک کی اہم مذہبی، سیاسی اور سول سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی شخصیات شامل تھیں۔انڈونیشیا میں اسلام اور اسلامی جماعتوں اور اداروں کی نوعیت اور ان کے سماجی کردار بارے ہم نے پہلے بھی اپنے ادارے سے کچھ تحقیقی کام کیا تھا۔اب اس وفد کے ساتھ وہاں کے مذہبی حلقے سے براہ راست ایک تعلق پیدا ہوا اور بہت سے نئے تجربات سامنے آئے۔

انڈونیشیا کے ساتھ مذہبی سفارتکاری کے اقدام کی کیا اہمیت ہے ، ہمارے مذہبی حلقے کیا استفادہ کر سکتے ہیں اور مزید کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے،اس بارے زیر نظر کتاب میں قارئین کو کافی کچھ مل جائے گا۔اُمید ہے کہ ہم انڈونیشیا کے ماڈل سے استفادہ کر پائیں گے اور مزید عملی اقدامات بھی جاری رہیں گے۔

محمد اسرار مدنی
ircra313@yahoo.com

انڈونیشیا کی مذہبی جماعتوں کا شدت پسندی کے خلاف کردار

عبدالرحمان الواحد[i]

دین اسلام میں انسان کی تربیت و تزکیہ کو بہت زیادہ زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ انسان میں جس طرح اس کی خارجی ضروریات اور داعیے ہوتے ہیں جو اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی، اسی طرح سے فرد کے کچھ داعیے داخلی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں جو خیر بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی۔ انسان کا نفس اسے بہت سی برائیوں کی طرف دھکیلتا ہے اور مختلف طریقوں سے اسے ابھارتا ہے کہ وہ انہیں پورا کرے۔ بعض اوقات یہ داعیے بہت ہی خوبصورت نعروں اور پردوں کا لبادہ اوڑھے ہوتے ہیں اور انسان کے لیے غلط و صحیح میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں کتنی ہی ایسی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں جو بہ ظاہر تو مذہب اور مذہبی اصطلاحات استعمال کرتی ہیں، لیکن وہ اصل میں دین کی روح کے خلاف کام کر رہی ہوتی ہیں۔ یہی حال انفرادی سطح پر بھی ہوتا ہے۔

لہذا، جو داخلی دشمن ہوتا ہے وہ زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہو سکتا ہے۔ وہ داخلی دشمن انفرادی و اجتماعی، دونوں سطح پر جو چیلنج پیدا کرتا ہے اس کا سامنا کرنا اور مقابلہ کرنا ایک جہاد ہے۔ روحانی اور جسمانی جذبات کے درمیان تناؤ اکثر افراد اور معاشرے دونوں کے اندر تنازعات کو ہوا دیتا ہے۔ اس تناظر میں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں فتح کے بعد اپنے صحابہ سے کیا کہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

قَدِمْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ۔ (تم چھوٹے جہاد سے بڑے کی طرف لوٹ

---

[i] آپ نہضۃ العلماء کے سربراہ رہے۔ اس تنظیم کے بانی ہاشم الشعراوی کے پوتے ہیں۔ انڈونیشیا کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ 2009 میں وفات ہوئی۔ یہ مضمون عبدالرحمان واحد کے مضمون 'The Enemy Within' کا خلاصہ ہے۔

آئے ہو)

صحابہ کرامؓ نے پوچھا: کہ اس سے بڑی جنگ اور کیا ہو سکتی ہے جو ہم نے ابھی لڑی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، "اپنے نفس کے خلاف جنگ،" یہ سن کر صحابہ کرامؓ خاموش ہو گئے، یہ کیونکہ انہیں علم تھا کہ اس دشمن پر قابو پانا کتنا مشکل ہے۔ اس داخلی دشمن کی شناخت ہی مشکل ہونے کے علاوہ، اس کے خلاف جدوجہد میں استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔

نفسانی جبلتیں ایک طاقتور قوت ہیں جو ہمیشہ ایک تباہ کن صلاحیت کو جنم دیتی ہیں۔ اسلامی اسکالرز اکثر اس ہوس (طاقت، دولت، جنسی تسکین وغیرہ کی) کا ایک وحشی درندے سے موازنہ کرتے ہیں۔ جو بھی شخص اپنی نفسانی فطرت کو قابو کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اندرونی سکون حاصل کر لیتا ہے، اور اپنی توانائیاں دُور رس، بلند اور عظیم مقاصد کے حصول کے لیے لگا سکتا ہے۔ دوسری طرف، جس پر بھی انا پرستی اور ہوس کا غلبہ ہو گا وہ مستقل بے چین اور اضطراب کی حالت میں رہے گا، اور وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی خطرہ ہے۔

اس نقطہ نظر سے، دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں: پہلے، وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی نفسانی فطرت کو قابو میں کیا ہے، اور اس طریقے سے کام کیا ہے جو بڑے پیمانے پر معاشرے کے لیے فائدہ مند ہو۔ یہ پر سکون اور پر امن نفوس (النفس المطمئنہ) روحانیت کا مجسمہ ہیں، زمین پر خدا کے حقیقی نائبین ہیں۔ دوسرے قسم کے لوگ وہ ہیں جن پر انا پرستی اور مختلف قسم کی ہوس کا غلبہ ہوتا ہے، اور اس طرح وہ مستقل تذبذب کا شکار ہیں، اور یہ دوسروں اور بڑے پیمانے پر معاشرے کے لیے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ یہ بری روحیں (النفس اللوامہ) لاتعداد سماجی اتھل پتھل اور جھگڑوں کو جنم دیتی ہیں، اور خود غرضی کی ہوس کی عکاسی کرتی ہیں۔

جدید انڈونیشیا کی تاریخ میں، ہم قومی بیداری کی اٹھان اور ارتقاء کے دوران عظیم نفوس کی موجودگی کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ یہ وہ نفوس تھے جنہوں نے خاص طور پر اسلام اور انڈونیشیائی قوم پرستی کے درمیان قربت پیدا کی اور انہیں ہم آہنگ کیا۔ بہت سے لوگ انڈونیشیائی ماڈل کو پسند تو کرتے ہیں

لیکن وہ انڈونیشیائی قوم کی ترقی کے اہم عوامل کے بارے میں نہیں جانتے۔ 1919 میں، دراصل تین کزنز نے مذہبی تعلیمات اور انڈونیشیائی قومیت کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے سے متعلق ہفتہ وار گفت و شنید شروع کی۔ وہ تین افراد یہ تھے، عمر سعید جو کرومنیتو، ہاشم الشعراوی اور اور حاجی وہاب۔ یہ لوگ ہفتہ وار نشست منعقد کرتے جو کئی سالوں تک چلتی رہیں۔ انہوں نے ہی چند سال بعد تنظیم نہضۃ العلماء کی بنیاد رکھی تھی۔

1935 میں بنجرماسین، بورنیو میں منعقدہ نہضۃ العلماء (NU) کی مجلس کے دوران، تنظیم نے اسلامی ریاست کے قیام کی حمایت نہ کرنے کا فیصلہ کیا، اور اس نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ ریاستی ڈھانچے پر زور دینے کی بجائے، اسلامی تعلیمات پر عمل کریں، تاکہ ایک تکثیری قومی ریاست کے فریم ورک کے اندر ایک حقیقی اسلامی (باعمل اور روشن خیال) معاشرہ تشکیل دیا جاسکے۔ دس سال بعد، انڈونیشیا کے مسلم رہنماؤں نے جو آزادی کی جدوجہد میں شامل تھے، سوکارنو کی طرف سے پیش کیے گئے قومی اصول 'پانچاسیلا'[ii] کو قبول کیا۔ اس وقت کی زیادہ تر اسلامی تنظیموں کے سربراہان نے اس اصول کو تسلیم کیا تھا کیا تھا۔ 17 اگست 1945 کو سوکارنو اور محمد ہتا نے انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کیا، اس طرح ایک ایسی قوم کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا بنیادی آئین اور ریاستی نظریہ ثقافتی اور مذہبی تکثیریت کی روایات کو تسلیم کرتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔

مذہب اور قومیت کے درمیان پائے جانے والے اتار چڑھاؤ پر مبنی رشتوں کے پیش نظر یہ کوئی آسان عمل نہیں تھا۔ جو مشکلات پیدا ہوئیں وہ تاریخی حقائق ہیں جنہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انڈونیشیا کی تاریخ میں کئی ادوار ایسے تنازعات کی وجہ سے خون میں رنگے ہیں جو اکثر مذہب کے نام پر وقوع پذیر ہوئے۔ اسی لیے انڈونیشیا کے مسلم مذہبی اسکالرز نے طے کیا کہ ایک ایسا سماج کہ جس میں مذہبی تنوع بہت زیادہ ہے، وہاں خالصتاً مذہب کو شہریت کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ اس لیے قومیت کے افکار کو

[ii] ایک خدا، مہذب انسانیت، انڈونیشیا کی وحدت، جمہوریت، عدل اجتماعی

فروغ دیا گیا اور ساتھ ہی مذہبی اقدار کا رنگ بھی باقی رکھا گیا۔ مذہبی اقدار اور قومیت کا یہ انضمام 'پانچ سیلا' (Pancasila) کے اصول میں نظر آتا ہے۔ اس ملک کے بانیوں نے تسلیم کیا کہ اس اصول میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو مذہبی تعلیمات سے متصادم ہو۔ بلکہ، اس اصول کے اجزاء تمام مذاہب کی اعلیٰ ترین اقدار کی عکاسی کرتے ہیں، جن میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جنہیں اسلام میں 'مقاصد شریعت' کہا جاتا ہے۔

انڈونیشیا کے بانیان نے ریاست کو ایک ایسے ادارے کے طور پر حیثیت دی کہ جو تکثیریت کو تسلیم کرتا ہے، تمام شہریوں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے، اور انڈونیشیائی معاشرے میں تمام عقائد، ثقافتوں اور روایات کا احترام کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انہوں نے Pancasila کی بنیاد رکھی، تاکہ مذہب کو اس کے حقیقی معنوں میں تمام مخلوقات کے لیے خدا کی نعمت کے مظہر کے طور پر فروغ دیا جائے۔ Pancasila کے مثالی تناظر میں، ہر ایک شہری دنیاوی خوشحالی کے حصول میں ہر کسی کا معاون بنے گا۔

لیکن سیاست و ریاست سے متعلق اس طرح کی سوچ انڈونیشیا کی تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں میں نہیں رہی ہے۔ صدر سہارتو کی حکومت (1966-68) کے خاتمے سے کچھ عرصہ پہلے اور بعد میں نمودار ہونے والی مختلف عوامی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں میں اس طرح کے رویے کی عکاسی نہیں ہوتی۔ یہ نئی تنظیمیں دارالاسلام (DI) تحریک کی طرح ہیں، جو انڈونیشیا کو آزادی کے بعد واضح طور پر ایک مذہبی ریاست میں تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح کی جماعتیں Pancasila کے ریاستی نظریے کو ختم کر کے اپنے مخصوص مذہبی ورژن سے تبدیل کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے مطابق وہ مذہب کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھتے ہیں اور خدا کے نائب کے طور پہ وہ دنیا حکمرانی کے حقدار ہیں۔ یہ دعویٰ بالکل ناقابل قبول ہے اور مذہبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے مسترد کر دینا چاہیے۔ انتہا پسند درست کہتے ہیں کہ طاقت صرف اللہ کی ہے (لا حکم الا لِلله)، لیکن کوئی ایک انسان یا جماعت اللہ کی قدرت و منشا کو پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتے۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب بھی اسلام ایک آئیڈیالوجی میں تبدیل ہوتا ہے تو یہ تنگ اور

محدود، نظریاتی اصولوں اور سیاسی پلیٹ فارمز تک محصور ہو جاتا ہے۔ مگر سخت گیر مذہبی عناصر مذہبی نعروں اور اصطلاحات کا غلط استعمال کر کے عام لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ ان کا اصل مقصد اپنے انا پرستی اور مادی ایجنڈے کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ بنیاد پرستی کے اس عمل کو محدود یا ختم کرنے کے لیے اسلام کے بارے میں عوام کے علم کی سطح کو بہتر بنایا جائے، تاکہ وہ کھلے ذہن کے مالک ہوں، اور وہ اس کی روح اور جوہر کو سمجھ سکیں۔

دین اسلام کا مذہبی پہلو، تمام ریاستی امور کو اپنے کنٹرول میں نہیں لیتا۔ اہل مذہب کی اُمورِ سیاست میں شرکت پر نہ پابندی ہے اور نہ ہی یہ لازمی ہے۔ چودہ سو سالہ تاریخ اسلام سے واضح ہوتا ہے کہ کبار ائمہ و اسلاف نے عموماً سیاسی و ریاستی معاملات سے الگ تھلگ رہ کر ہی مذہب کی خدمت کی اور اہل مذہب کے لیے یہی اسوہ بہترین راستہ ہے۔ لیکن اس کا یہ معنی لے لینا کہ دین اسلام ریاستی و سیاسی معاملات میں کوئی رہنمائی نہیں دیتا یا ریاست و سیاست کے باب میں اسلام کا کوئی تعلق و واسطہ نہیں، یہ دوسری انتہا اور اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت ہے۔ اسلام یقیناً ریاستی و سیاسی امور میں دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو برابر شہری کی حیثیت دیتا ہے بلکہ میثاق مدینہ میں حضور اکرم ﷺ نے یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے لیے ریاست مدینہ کے تناظر میں 'ملۃ واحدہ' یعنی ایک قوم کا عنوان دیا۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات کے مطابق کسی خاص جغرافیائی اکائی کے لوگ مل کر اسلامی اصولوں کے مطابق ریاستی نظم و نسق قائم کر کے کسی عمرانی و آئینی دستاویز پر متفق ہو جائیں تو اس ریاست کے تمام شہری بلا تفریق مذہب و نسل ایک قوم تشکیل دیتے ہیں۔ اسلام نے ریاست کے سربراہ کے تقرر کے لیے اس ریاست کے شہریوں کی خاطر اتفاق رائے یا کثرت رائے کا اصول مقرر کیا ہے۔ امورِ ریاست آمریت یا شخصی حکومت کے بجائے مشاورت سے چلانے کا ضابطہ مقرر کیا ہے جیسا کہ 'وأمرهم شورٰى بينهم' کا قرآنی حکم اس باب میں واضح ہے۔ اسلام نے حکمرانوں اور اہل شوریٰ (ممبران پارلیمنٹ) کے لیے عدل، صدق، امانت، دیانت، علمی و ذہنی قابلیت اور جسمانی صحت کے معیارات مقرر کیے ہیں۔ طرزِ حکومت اور نظامِ انتخابات کو اسلام نے اجتہادی امور کے طور پر کھلا چھوڑ دیا تاکہ ہر دور کے تقاضوں اور معاشرے کے رجحانات و میلانات اور معاشرتی صورت کے مطابق اس کی

شکل بنائی جاسکے۔

انڈونیشیا میں بین الاقوامی انتہا پسند تحریکیں اور ان کے ہمنوا طویل عرصے سے محمدیہ تنظیم کے اندر دراندازی میں مصروف ہیں۔اس کی شروعات جولائی2005 میں مشرقی جاوا میں ہونے والی محمدیہ کی ایک کانفرنس میں اس وقت ہوئی جب انتہا پسند عناصر، بشمول تنظیم 'فلاحی جسٹس پارٹی'(PKS :Prosperous Justice Party)اور حزب التحریر کے لوگ سازشوں کے ذریعے محمدیہ کے داخلی ڈھانچے میں اپنے ہمدرد عناصر کو شامل کرانے اور انہیں منتخب کرانے میں کامیاب ہوگئے۔جب پروفیسر عبدالمنیر ملحان نے صوبہ سماٹرا میں واقع اپنے آبائی گاؤں کا دورہ کیا تو محمدیہ کی بنیاد پرست دراندازی کا مسئلہ ایک بڑے تنازعہ کی شکل اختیار کر گیا، جس کے اثرات بین الاقوامی سطح پر بھی دیکھے گئے۔

جب اس طرح کے معاملات ہونے لگے اور یہ واضح ہونے لگا کہ محمدیہ تنظیم مجموعی طور پہ خطرے کی زد میں ہے، کہ اس میں دنیا کی انتہا پسند تحریکوں کے اثرات غالب آرہے ہیں تو انڈونیشیا میں بہت سے مسلم اسکالرز اور علما آگے آئے اور انہوں نے نشاندہی کرنی شروع کی کہ محمدیہ تنظیم کو اس طرح کے اثرات سے بچانا ضروری ہے۔کیونکہ یہ ایک بڑی جماعت ہے اور لاکھوں لوگ اس کی اتباع کرتے ہیں۔اس لیے اگر صورتحال ایسے ہی جاری رہی تو ملک میں مسائل جنم لے سکتے ہیں۔پوری دنیا میں اس پر گفتگو کی جانے لگی۔

تب اس مسئلے کو 'تربیہ وائرس' کا نام دیا گیا تھا، کیونکہ تربیت اور دینی تعلیم کا استعمال کرتے ہوئے بنیاد پرستی فروغ پا رہی تھی۔'تربیہ وائرس' ایسے کارکن پیدا کرتا ہے جو اسلام کے بارے میں سخت گیر اور بنیاد پرست تفہیم رکھتے ہیں۔اس طرح کے واقعات محمدیہ کی قیادت اور انڈونیشیا کے عام خاندانوں میں شدید مایوسی کا باعث بنے۔وہ بیٹے اور بیٹیاں جن سے انہیں امید تھی کہ وہ محمدیہ کی مستقبل کی ترقی کو آگے بڑھائیں گے، درحقیقت خود محمدیہ کے دشمنوں میں تبدیل ہونے لگے تھے۔

یہ مسئلہ صرف محمدیہ کو ہی پیش نہیں آیا، بلکہ خود نہضۃ العلماء کو بھی اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا

تھا۔اس کی بہت سی مساجد شدت پسند گروہوں کے قبضے میں آگئی تھیں۔اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نہضۃ العلماء نے مساجد اور دیگر مقامات پر اپنے تنظیمی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کے لیے ایک مہم شروع کی۔ نہضۃ العلماء کے مرکزی بورڈ نے کھل کر اعلان کیا کہ بین الاقوامی اسلامی تنظیمیں اور حزب التحریر خطرناک سیاسی تحریکیں ہیں جن سے سنی تعلیمات کو خطرہ لاحق ہے اور یہ تنظیمیں قوم کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ بنیاد پرست اگر نہضۃ العلماء کی تعلیمات اور روایت کو قبول کرنے کا اظہار کرتے ہیں تو یہ اور بھی خطرناک ہے،، کیونکہ یہ چیز انہیں کسی بھی وقت، کہیں پہ بھی دراندازی کرنے کے قابل بناتی ہے۔ جب کہ خلافت کے مسئلے پر، نہضۃ العلماء کے سرکاری فورم 'مجلس بحث المسائل' نے باضابطہ طور پر اعلان کیا کہ عصر حاضر کے لیے اسلامی خلافت کی کوئی مذہبی بنیاد نہیں ہے، نہ تو قرآن میں اور نہ حدیث میں۔

نہضۃ العلماء اور محمدیہ ملک کی سب سے بڑی اور مؤثر تنظیمیں ہیں اور انڈونیشیا کی قومی سالمیت کے تحفظ میں ان کی روایات و تفہیم کا کردار رہا ہے۔ لہذا، اس اہم کردار کو پورا کرنے کے لیے، ان تنظیموں کو داخلی سطح پر روحانی احیاء کرنا چاہیے اور اپنی اعلیٰ اقدار کی طرف لوٹنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے دونوں جماعتوں نے کوششیں کی ہیں اور مزید کرنے کی ضرورت ہے۔ مذہبی زبان کا استعمال بنیاد پرستوں کو انتہائی خطرناک بنا دیتا ہے، کیونکہ یہ چیز انہیں آسانی سے بہت سے مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور تقریباً کہیں بھی، کسی بھی وقت دراندازی کرنے کے قابل بناتا ہے۔ انتہا پسند عناصر نے انڈونیشین کونسل آف ریلیجیئس اسکالرز (مجلس علماء انڈونیشیا، MUI) میں بھی دراندازی کی۔ جس کی شناخت کرلی گئی تھی۔ اس سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سخت عناصر کس حد تک فعال اور خطرہ ہیں۔

نہضۃ العلماء اور محمدیہ ہمیشہ شدت پسندوں کے عزائم کے سامنے رکاوٹ بنی رہیں۔ ان دونوں مذہبی تنظیموں سے وابستہ علماء اور دانش وروں نے شدت پسندوں سے زبردست نظریاتی جنگ لڑی اور انہیں شکست دی۔ چناں چہ شدت پسند انڈونیشی معاشرے میں اپنے نظریات و خیالات پھیلانے میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

نہضۃ العلماء اور محمدیہ کے علما نے شدت پسندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے مدد لی۔

وہ عوام کو دکھانا چاہتے تھے کہ کتاب و سنت میں شدت پسندی کو کس نظر سے دیکھا گیا ہے۔ انہوں نے شدت پسندوں کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے، بلکہ دلائل کی مدد سے مقابلہ کیا۔ یہ علماء اپنی تحقیق، تجربے اور سعی سے اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثر اسلامی ممالک میں دو وجوہ کی بنا پر شدت پسندی میں اضافہ ہوا۔ ایک تو اس لیے کہ جو سخت گیر مذہبی رہنما اہل مغرب سے جنگ اور قتل و قتال چاہتے تھے، وہ اپنی کتب میں سیاق و سباق اور تاریخی پس منظر کا ذکر کیے بغیر آیات قرآنی اور احادیث کے حوالے دینے لگے۔ گویا انہوں نے پہلے کتاب و سنت میں اپنے دلائل کی توثیق کرنے والے من پسند حوالے ڈھونڈے اور پھر انہیں موجودہ حالات پر منطبق کر دیا۔ ان عناصر نے اپنے نظریات کی ترویج واشاعت کے لیے کتب و رسائل بھی تحریر کیے۔ دوسرا یہ کہ انڈونیشیا میں ایک وقت ایسا آیا کہ مذہبی مدارس میں ایسے اساتذہ بھی پڑھانے لگے جو کسی مستند مدرسے کے سند یافتہ نہیں تھے۔ یہ ناتجربہ کار اساتذہ پھر اپنے شاگردوں کو بھی شدت پسندانہ تعلیم دینے لگے۔ یوں شدت پسندی کی چنگاریاں پھیلتی چلی گئیں۔

اس کے رد عمل میں نہضتہ العلماء اور محمدیہ کے علماء نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کو اور اسلام کی صحیح تعلیمات کو عوام الناس تک پہنچایا اور پھیلایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے قومی اخبارات میں مضامین لکھے، پمفلٹ چھپوائے، مساجد اور جلسوں میں اور ٹیلیویژن پر تقاریر کیں اور شدت پسندی بڑھنے کے عوامل پر مکالمے کیے۔ ساتھ ساتھ انہوں نے اسلام کا حقیقی رخ بھی انڈونیشی عوام و خواص پر واضح کیا جو محبت، امن، رواداری، برداشت، حلم، دوستی اور ہمدردی کی لازوال خوبیوں سے روشن و تاباں ہے۔

سخت گیر تحریکوں کی مخالفت کرنے کی بنیادی وجہ اسلام کی عزت اور احترام کو بحال کرنا ہے، جس کی انتہا پسندوں نے بے حرمتی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پانچاسیلا اور جمہوریہ انڈونیشیا کی وحدت کا تحفظ کرنا ہے۔ انتہا پسندوں کے خلاف جدوجہد میں فتح اسلامی تعلیمات کی عظمت کو بحال کرے گی۔ اسلام رحمت للعالمین ہے، یہ تمام مخلوقات کے لیے ایک نعمت ہے، اور ایک پرامن دنیا کی تعمیر کے لیے ایک اہم کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقلیت کا معاصر مفہوم اور جدید اجتہاد: انڈونیشیا کے تناظر میں جائزہ[i]

احمد رجب برہانی، محمد نور پرابوو

اقلیت کا مفہوم

اقلیت کا مسئلہ پوری مسلم دنیا میں کافی حساسیت کا حامل ہے۔اس ضمن میں اقلیت کی حیثیت متعین کرنے اور ان سے متعلق نقطہ نظر پالنے کا کوئی ایک معیار یا رجحان نہیں ہے۔ مغرب میں تو اقلیت کا مفہوم بہت واضح ہے اور اس کی تعریفات میں بھی کوئی زیادہ اختلافات نہیں ہیں۔ مگر مسلم دنیا میں ایسا نہیں ہے۔ ہم اس مضمون میں دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اقلیت کا مذہبی متون و نصوص میں کیا حکم ہے، اور انہیں کیا حیثیت دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انڈونیشیا میں اقلیت سے متعلق کیا فکری و عملی رویے ہیں، اس پر بھی گفتگو کریں گے۔

اقلیت کا عام طور پر مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ معاشرے کا ایسا گروہ جو کم تعداد میں ہے۔یعنی کہ اعداد و شمار کی بنیاد پر اقلیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ ایسا طبقہ جو سیاسی طور پہ، معاشی طور پہ یا سماجی حیثیت میں خود کو مرکزی دھارے میں مساوی محسوس نہیں کرتا، جو اپنے حقوق حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرتا ہے وہ اصل میں اقلیت ہے۔ قرآن کریم میں ایک لفظ 'مستضعفین' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سماج میں کمزور ہوتے ہیں اور انہیں سیاسی و معاشی سطح پر اس طرح تسلیم نہیں کیا جاتا جیسے

---

[i] یہ مضمون infid کے زیر اہتمام شائع شدہ کتاب Indonesian Islam For The World میں شائع شدہ احمد رجب برہانی اور محمد نور پرابوو کے مضمون 'اسلام اقلیتوں کی حفاظت کرتا ہے' کا خلاصہ ہے۔

عمومی حیثیت میں باقی لوگوں کو مقام اور حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

2015 میں انڈونیشیا کی تنظیم محمدیہ نے کچھ امور سے متعلق اپنی سفارشات دی تھیں۔ان میں سے ایک اقلیت کا معاملہ بھی تھا۔جماعت نے یہ موقف پیش کیا تھا کہ اقلیت کے تصور کو صرف مذہبی پس منظر میں ہی محدود نہیں کرنا چاہیے۔بلکہ وہ تمام طبقات جو معاشی اور سماجی لحاظ سے کمزور اور کم حیثیت ہوں وہ سب ہی اقلیت کے زمرے میں آتے ہیں۔اس میں مزدور، معذور طبقہ اور نسل پرستی کا شکار لوگ بھی شامل ہیں۔ایسے ہیں جو افراد جنسی زیادتیوں کا شکار ہوں وہ بھی مظلوم اور کمزور ہونے کی وجہ سے اقلیت کی اصطلاح کے زمرے میں آئیں گے۔

محمدیہ کی طرف سے جاری کیا جانے والا یہ بیان بہت ہی منفرد اور آج کے لحاظ سے مؤثر ہے۔اقلیت کی یہ تعریف نہ صرف لوگوں کو اقلیت کے بارے میں آگاہ کرتی اور ان کا تعارف کراتی ہے، بلکہ ان میں تحریک بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ ان کمزور طبقات کے حقوق اور بہتری کے لیے کردار ادا کریں۔کیونکہ اقلیت کی کوئی بھی ایسی تعریف، جیسا کہ مروج معنوں میں مذہبی تناظر میں کی جاتی ہے، اس سے بس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مخصوص طبقے کا تعارف بتایا جارہا ہے کہ جو تعداد میں اکثریتی طبقے سے کم ہے۔ اقلیت کی اس نوع تعریف میں حقوق کے لیے تحریک کا داعیہ موجود نہیں ہوتا۔اگر کسی سماج میں اقلیت کا تعارف یا ان کا درجہ اس طرح کا ہو جائے کہ کمزور محسوس ہوں تو، ایسے میں ضروری ہو جاتا ہے کہ اقلیت کی اصطلاح کی جدید تشریح کی جائے۔بلکہ دیکھا جائے تو یہ جدید تشریح کوئی نئی نہیں ہے بلکہ قرآن کریم میں ایسے لوگوں کو 'مستضعفین' کہا گیا ہے، یہی اقلیت ہیں۔

اقلیت کے لیے جدید اجتہاد

انڈونیشیا کی تنظیم محمدیہ میں نوجوان کارکن اور ممبران اقلیت کے حقوق کے لیے کافی حساسیت رکھتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے تنظیم کے کئی رہنما اس بارے نصائح کرتے رہے ہیں اور اس موضوع پر کتب بھی تصنیف کی ہیں۔فکری تربیت سے ہٹ کر اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ محمدیہ ایک مذہبی تنظیم کے طور پر ہمیشہ سماجی سطح پر لوگوں کو بااختیار بنانے کی تحریکوں کو ترجیح دیتی ہے۔قرآن کریم کی

آیات کی ترقی پسند تشریح جس میں مستضعفین گروہ کے حوالے سے بھی اشارات ہیں محمدیہ میں واضح نظر آتی ہے۔ محمدیہ تنظیم کے رہنماؤں نے اقلیتوں اور مستضعفین کی بہبود پر بہت کلام کیا ہے۔ان کے مطابق مستضعفین وہ لوگ ہیں جو سماجی اور ثقافتی طور پر مظلوم ہیں۔ تنظیم کا خیال ہے کہ اس طرح کی تقسیم اور اس کی بنیاد پر عدم مساوات دراصل ایک سماجی برائی ہے اور لوگوں کے وجود کو اس طرح کی "معاشرتی برائی" سے آزاد کرنے کے لیے ایک "نئی سماجی الہیات" کی ضرورت ہے۔

اسی طرح نہضۃ العلما کے بہت سے رہنما ایسے ہیں جو نوجوانوں کو اقلیتی گروہوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ذرائع ابلاغ میں ان کے رویے اور تحریریں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اقلیتی گروپ کے ساتھ ہمیشہ کھڑے رہنے کا عزم کرتے ہیں۔یہ جماعت بھی مذہب اور عقیدے کی آزادی کی بات کرتی ہے اور اس کا دفاع کرتی ہے۔انڈونیشیا میں اقلیتوں کے لیے جدید اجتہاد پر زور دینے والے طبقات دو سطح پر اقلیتوں کے حق میں مساعی کرتے نظر آتے ہیں۔ سماجی اور اقتصادی حوالے سے بااختیار بنانے کی وکالت اور پالیسی بنانا۔اور دوسرا، علمی و فکری تربیت کرنا اور اس کے لیے مواد کی تشہیر کرنا، جن میں تحقیقی رپورٹس، کتابیں، مضامین، اور سوشل میڈیا بیانات شامل ہیں۔

قرآن کریم میں مستضعفین

قرآن کریم میں مستضعفین کی اصطلاح کم از کم 13 مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔اس کے علاوہ ایک ملتی جلتی اصطلاح 'ضعفاء' قرآن میں 52 مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔ان کا ذکر ہمیشہ اسی طرح کیا گیا ہے کہ یہ لوگ معاشرے میں سیاسی اور انسانی حقوق کے لحاظ سے نچلے درجے پر ہوتے ہیں اور ان کا عام طور پہ خیال نہیں رکھا جاتا۔

اسلام مستضعفین اور اقلیت کے تحفظ کے لیے بہت سے اقدامات تجویز کرتا ہے۔وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ ان کا خیال رکھا جائے بلکہ سماجی انصاف پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔

قرآن کریم میں مستضعفین کی چند قسمیں بیان کی گئی ہیں مستضعف فکری ، مستضعف ثقافتی ،

مستضعف اقتصادی، مستضعف اخلاقی، مستضعف سیاسی۔ جبکہ اس کے مقابل جس گروہ کا ذکر ہوتا ہے اسے ظالمین کہا گیا ہے، یعنی وہ لوگ جو اکثریت میں ہوتے ہیں اور سیاسی حوالے سے طاقتور ہوتے ہوئے مستضعفین کا خیال نہیں رکھتے یا انہیں زیادتی کا نشان بناتے ہیں۔ ظالمین وہ گروہ ہوتا ہے جو پہلے لوگوں کو فکری اور ثقافتی اعتبار سے ضعیف بناتا ہے اور جس کے نتیجے میں دوسرا گروہ خود ہی اقتصادی حوالے سے ضعیف ہو کر دوسرے میدانوں میں بھی بہت پیچھے رہ جاتا ہے، ان میں کسی قسم کی طاقت باقی نہیں رہ جاتی، ایسے گروہ کے اندر ظالمین کے تسلط کے خلاف کھڑا ہونے کی قوت نہیں باقی رہتی۔

قرآن مجید نے پانچ مقامات پر مستضعفین کو اس انداز سے مخاطب کیا ہے جیسے مومنین کو خطاب کرتا ہے۔ قرآن ایک اور جگہ پر مومنین کو مستضعفین کی مدد کرنے کا حکم دیتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَاۚ وَاجْعَل لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَل لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔[ii]

(اور تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کے راستے میں نہ لڑو اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہمیں اس شہر سے نکال دے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنادے اور ہمارے لئے اپنی بارگاہ سے کوئی مددگار بنادے)

مذاہبِ عالم اور ادیان کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی تعلیمات میں سائلین، محرومین، مستضعفین اور کسی بھی انداز کی معذوری اور محتاجی کے سد باب کے اشارے یا واضح بیانات موجود ہیں۔ مذاہب عالم کی تعلیمات میں ممکن ہے معذور اور اپاہج کے الفاظ نہ ملیں یا براہ راست ایسے لوگوں کے بارے واضح تصورات کا ذکر نہ ہو مگر ان کی تعلیمات میں محرومین کی فلاح اور دیکھ بھال کرنے اور مختلف حوادث کا

[ii] النساء:57

شکار ہونے والے طبقہ کی بھلائی کے واضح احکامات موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی مخلوق کی صفات کے ساتھ ساتھ اس کے کچھ جبلی حقائق کا ذکر بھی کیا ہے۔ کہیں 'انسان خسارے میں ہے' کے الفاظ کہہ کر متنبہ کیا۔ کہیں مال و دولت اور اولاد کو فتنہ قرار دیا، اور کہیں ارشاد ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار میں حریص ہیں۔ اُنہیں اپنی ضروریات کی پرواہ نہیں مگر دوسرے ضرورت مند بھائیوں کے بارے ان کے دل میں نہ تنگی ہے اور نہ بوجھ محسوس کرتے ہیں۔ یہ اسلوب اصل میں اقلیت اور مستضعفین کی بھلائی کو یقینی بنانے کے لیے اختیار کیا گیا۔ مثلاً ارشاد فرمایا:

وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔[iii]

(اور وہ جنہوں نے ان مہاجرین سے پہلے اس شہر کو اور ایمان کو ٹھکانہ بنالیا وہ اپنی طرف ہجرت کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور وہ اپنے دلوں میں اس کے متعلق کوئی حسد نہیں پاتے جو ان کو دیا گیا اور وہ اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود حاجت ہو اور جو اپنے نفس کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ کامیاب ہیں)

انسانی عالمگیر عدل

اسلام ان تمام حقوق میں، جن کا تعلق ریاست کے نظم و ضبط اور شہریوں کے بنیادی حقوق سے ہو غیر مسلم اقلیتوں اور مسلمانوں کے درمیان عدل و انصاف اور مساوات قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں ان غیر مسلموں کے ساتھ، جو اسلام اور مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں، خیر خواہی، مروت، حسن سلوک اور رواداری کی ہدایت دی گئی ہے۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ

[iii] الحشر:9

تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ-اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔[iv]

(اللہ تمہیں ان لوگوں سے احسان کرنے اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین میں لڑائی نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے)

اسلام شرفِ اِنسانیت کا علمبردار دین ہے۔ اس میں کوئی ایسا اصول یا ضابطہ روا نہیں رکھا گیا جو شرف انسانیت کے منافی ہو۔ دیگر طبقات معاشرہ کی طرح اسلامی ریاست میں اقلیتوں کو بھی ان تمام حقوق کا مستحق قرار دیا گیا ہے، جن کا ایک مثالی معاشرے میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کی اساس معاملات دین میں جبر واکراہ کے عنصر کی نفی کر کے فراہم کی گئی:

لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىَ لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ[v]

(اور کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور ہمارے لیے اپنے ہاں سے کوئی حمایتی کردے اور ہمارے لیے اپنے ہاں سے کوئی مددگار بنادے)

دین اسلام کی یہ نمایاں خاصیت ہے کہ وہ غیر مسلم شہریوں سے عداوت رکھنے کی بجائے ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے درجہ و حیثیت کے مطابق کیا جائے۔ لہٰذا جو بھی اقلیتیں ریاست کے اندر شہری کی حیثیت سے قیام پذیر ہوں ان کے ساتھ شفقت و مروت کے برتاؤ کا حکم ہے۔ اسلام ریاست کے شہریوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے کسی کو کم تر قرار نہیں دیتا۔ بلکہ آپس میں ایسے روابط کا درس دیتا ہے جن سے مستضعفین

[iv] الممتحنہ:8

[v] البقرہ:256

کی وحشت کم ہو۔ انہیں بود و باش میں سہولت ہو اور اسلامی قدروں سے شناسائی و استفادہ کا موقع ملے۔ قرآن مجید میں معاہدین کے ساتھ کیے گئے تمام عقود و معاہدات کی مکمل پابندی کا حکم دے گیا ہے۔

اگر کوئی ریاست کے اندر بغاوت نہ کرے تو اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ اس کے ساتھ سماجی انصاف کو یقینی بنایا جائے:

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔[vi]

(اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو، پس اگر ایک ان میں دوسرے پر ظلم کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے، پھر اگر وہ رجوع کرے تو ان دونوں میں انصاف سے صلح کرادو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

میثاق مدینہ میں اقلیت کے حقوق

رسول اللہ ﷺ اور سیرت النبی کا درس اولین دراصل پر امن بقائے باہمی ہے، آپ ﷺ نے جس طرح ایک نئی ریاست کی بنیادیں مضبوط کیں تو اسی طرح غیر اقوام سے امن وامان کے معاہدات بھی طے کیے، اس سے آپ ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ ساری انسانیت امن و سلامتی سے فائدہ اٹھائے، چنانچہ آغاز میں آپ ﷺ نے یہود مدینہ کے تینوں قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ، کے ساتھ ایک امن کا معاہدہ طے کیا جس میں انہیں دین و مذہب اور جان و مال کی مطلق آزادی دی گئی تھی۔ اس معاہدہ میں جلاوطنی، جائیداد کی ضبطی، یا جھگڑے کی سیاست کا کوئی رخ اختیار نہیں کیا گیا تھا، اس معاہدے کو

[vi] الحجرات:9

میثاق مدینہ کا نام دیا گیا۔

یہ وثیقہ صرف شہر کے مکینوں کے درمیان امن کا سیاسی معاہدہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک سماجی اور اخلاقی انقلاب بھی تھا جو مہذب اثرات اور انسانی مقاصد کا حامل تھا۔ یہ لوگوں کو جاہلیت اور کمزوری کی حالت سے نکالنے کے لیے آیا ہے، تاکہ قرآنی تصور کے مطابق، وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ اللہ تعالی تک رسائی کے لیے مختلف راستے اختیار کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک منزل تک پہنچنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کو نفرت کی نظر سے دیکھا جائے یا انہیں ڈرایا دھمکایا جائے یا ان سے امن وامان سے رہنے کا حق چھین لیا جائے۔

اقلیت کے تحفظ میں چیلنج

اقلیت کے تحفظ میں درپیش چیلنج پر بات کرنے سے قبل پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلم تاریخ میں شروع میں اقلیت کے لیے ماحول بہت سازگار تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ تو اقلیت اور تمام انسانیت کے لیے رحمت تھے۔ آپ کی تعلیمات اور اعمال میں یہ واضح نظر بھی آتا ہے۔ اس کے بعد خلفاء راشدین کے ہاں بھی اقلیتیں محفوظ اور پرامن رہیں۔ انہیں برابر حقوق ملتے تھے۔ وہ تجارت کرتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا دور تو اس بارے میں بہت ہی سنہرا ہے۔ آپ نے یروشلم کو آزاد کرایا اور وہاں خون کا قطرہ نہیں گرنے دیا۔ آپ نے وہاں اقلیت کے لیے کوئی سخت احکامات بھی صادر نہیں فرمائے بلکہ اس کا خیال رکھا گیا کہ انہیں عبادت، معیشت اور رہن سہن میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

مگر بعد کے ادوار میں اقلیت کے لیے بعض مراحل پہ سختیاں کی گئیں۔ انہیں امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا گیا۔ بعض حکمران ان سے جزیہ بھی لیتے تھے۔ فقہاء نے بھی اقلیت کے لیے بہت سخت احکامات لکھے ہیں۔ انہیں اکثریت اور عام شہریوں سے کم تر درجے کا کہا گیا ہے۔ انہیں ذمی کا نام دیا گیا۔ اب چونکہ ایک جدید ریاست وجود میں آچکی ہے۔ اسلامی تعلیمات اور تمام ادوار بھی ہمارے سامنے کھلے ہیں تو ان سب کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ مروج سطح پر بعد کے ادوار میں جو سختیاں کیک گئیں وہ

درست نہیں تھیں۔

اس وقت سب سے بڑا ریاست اور مذہب کے تعلق کا ہے۔اس تعلق کو جتنا زیادہ آپس میں ضم کیا جائے گا اور اسلامی تعلیمات میں غور نہیں کیا جائے گا، یہ چیلنج کبھی ختم نہیں ہو گا۔آج علما کو چاہیے کہ وہ اقلیت کے جدید مفاہیم پر سوچیں۔ذمی کی اصطلاح پر نظر ثانی کریں اور اسے جدید فقہ سے نکال دیا جائے۔

مذہب وسیاست کے مابین تعلق: انڈونیشیااور ملائشیا کا معتدل ماڈل

ڈاکٹر ماجدہ علی صالح[i]

عصر حاضر کی مسلم فکر میں مذہب وسیاست کا تعلق

مذہب وسیاست کے درمیان تعلق کی نوعیت کے بارے مسلمان مفکرین کی آراء منقسم ہیں اور اس ضمن میں ہر نقطہ نظر کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں جن پر ان مواقف کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ سر دست ان دلائل کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود نہیں ہے۔ اگر ان مواقف کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سیاست ومذہب کے مابین تعلق کی نوعیت بارے اہل علم ومفکرین تین حصوں میں تقسیم ہیں:

(1) پہلا گروہ ان علماء ومفکرین پر مشتمل ہے جن کا خیال ہے کہ مذہب وسیاست کے درمیان اثبات ولزوم کا تعلق ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اسلامی ریاست کو قائم کریں۔ یہ حلقہ قومی ریاست کی اسلامی تشکیل کا حامی ہے اور بعض لوگ خلافت کے احیاء کے بھی داعی ہیں۔

(2) دوسرا گروہ پہلے کے بالکل برعکس رائے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک مذہب وسیاست کے مابین کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ ریاست کو مذہب سے الگ رکھنا ضروری ہے۔

(3) جبکہ تیسرا طبقہ سابقہ دونوں آراء میں درمیانی حیثیت کا قائل ہے۔ اس کا موقف ہے کہ

---

[i] ڈاکٹر ماجدہ علی صالح قاہرہ یونیورسٹی میں سیاسیات کے شعبے کی سربراہ ہیں ہیں کئی کتب تصنیف کر چکی ہیں۔ یہ مضمون تحقیقات کے شمارے 'مسلم دنیا اور جمہوریت: تحدیات وامکانات' میں شائع ہوا۔

مذہب وسیاست کے درمیان تعلق کی نوعیت نہ تو قطعی لزوم کی ہے بایں معنی کہ اسے ہر حوالے سے مذہبی بنیادوں پر ہی استوار کیا جائے اور نہ ان کے درمیان تعلق منافات وتضاد کا ہے۔ بلکہ یہ کہ سیاست میں مذہبی اقدار سے رہنمائی لی جاسکتی ہے اور شریعت کے واضح احکامات کے خلاف قوانین نہیں وضع کرنے چاہئیں، لیکن سیاسی نظم کا کوئی ڈھانچہ متعین نہیں ہے اور یہ کہ سماجی اٹھان شہریت کی اساس پر قائم ہونی چاہیے۔

تیسرے فریق کے مطابق ریاست نہ اسلامی ہوتی ہے اور نہ غیر اسلامی۔ یہ شہریت کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ اس کا ساختیاتی ڈھانچہ جمہوری ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ قوانین ایسے نہ وضع کیے جائیں جو نصوص کی واضح مخالفت کرتے ہوں۔ یوں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن بنائی جاسکتی ہے جو جدید بھی ہو اور اس میں اسلامی اقدار کی رعایت بھی رکھی گئی ہو۔ اس رائے سے شہریت کے مغربی تصور اور اسلامی تصور کے مابین فرق کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے مطابق ریاست کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی:

- ریاست کی بنیاد شہریت کے وصف پر قائم ہو گی جس کے تحت کسی بھی نوع کی طبقاتی تقسیم غیر اہم ہو گی۔
- قانون کو اہمیت حاصل ہو گی جس سے ریاست وسماج کے صحت مند رتعلق کی آبیاری ہو گی۔
- جمہوری ادارے قائم وفعال ہوں گے۔

اس سارے ڈھانچے میں مذہبی اقدار سے بے اعتنائی کا تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام میں اس نوع کے ریاستی وسیاسی سانچے کی تشکیل کی کوئی ممانعت موجود نہیں ہے۔

ایشیا میں مذہب وریاست کے تعلق کی بحث

ایشیا ایک ایسا خطہ ہے جہاں دنیا کے وہ مسلمان آباد ہیں جو تاریخی طور پہ انتہائی پر امن خیال کیے جاتے رہے۔ یہاں اسلام تاجروں کے ذریعے سے پہنچا اور تاریخی اعتبار سے اس خطے میں تہذیبی جنگیں نہیں ہوئیں۔ حالانکہ یہاں قدیم ترین الہامی اور الہامی مذاہب پائے جاتے ہیں لیکن ان کے درمیان ہمیشہ

ہم آہنگی کا ماحول قائم رہا۔ یہاں تہذیبی جنگیں اور عدم برداشت استعماری عہد کے بعد شروع ہوئی جب طاقت واختیارات کی کشمکش میں مذہبی فضا مکدر ہو کر رہ گئی اور آج یہ صورتحال ہے کہ ایشیا میں عدم برداشت بہت زیادہ ہے اور یہاں مسلح تحریکیں بھی قائم ہو گئی ہیں جن سے مسلمان فکری اور امن وامان کے لحاظ سے نبرد آزما ہیں۔

ایشیا میں مذہب وریاست کے تعلق کی بحث بھی استعماری عہد میں ہی شروع ہوئی جیسے کہ باقی مسلم دنیا میں۔ بلکہ سیاسی اسلام کے علمبرداروں میں سے ایک نمایاں شخصیت مولانا ابوالاعلی مودودی کی نسبت بھی اسی خطے سے ہے۔ استعماری عہد کے خاتمے کے بعد یہاں کے مسلم ممالک میں یہ سوال بھی اٹھے کہ دساتیر میں مذہب کو کیا حیثیت دینی چاہیے۔ بعض ممالک نے اپنے آئین میں اسلام کو سرکاری مذہب کا درجہ دیا اور بعض نے ایسا نہیں کیا۔ ایشیا کے وہ مسلم ممالک جنہوں نے اپنے آئین میں اسلام کو ریاست کا سرکاری دین کہا ہے وہ یہ ہیں:

ملائیشیا: ملائیشیا کے آئین کے آرٹیکل 3 میں کہا گیا ہے کہ اسلام ملک کا سرکاری مذہب ہو گا۔ اس کے ساتھ آرٹیکل 11 میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ ملک کے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو عبادت اور شعائر کی ادائیگی کی مکمل آزادی ہو گی اور مذہبی بنیادوں پر کسی طبقے کو حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

پاکستان: پاکستان کے آئین میں بھی شروع سے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام ملک کا سرکاری مذہب ہو گا۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں وضع کیا جائے گا۔

ایران: ایران کا آئین بھی اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے اثنا عشری مسلک ملک کی اکثریتی آبادی کا مسلک ہے۔

بنگلادیش: بنگلادیش ایک ایسا ملک ہے جس نے اپنے قیام کے ساتھ آئین میں یہ بھی اعلان کیا تھا کہ اسلام ان کا سرکاری مذہب ہو گا، لیکن 2012ء میں حکومت نے آئین سے اس شق کو نکالنے کا اعلان کیا تھا۔ اس پر ملک کی غالب اکثریت نے سخت احتجاج کیا جس کے بعد حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے

لیا۔

ان کے علاوہ ایشیا کے دیگر مسلم ممالک کی اکثریت نے آئین میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار نہیں دیا۔ان میں سے بالخصوص انڈونیشیا سرفہرست ہے جو آبادی کے اعتبار سے مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح وسطی ایشیائی ممالک نے بھی آئین میں ایسی تصریحات نہیں کی ہیں۔

ملائیشیا اور انڈونیشیا میں مذہب وریاست کا تعلق اور اثرات

جنوب مشرقی ایشیائی مسلم ممالک ملائیشیا اور انڈونیشیا ایسے خطے تصور کیے جاتے ہیں جہاں مذہب وریاست کا بحث اس طرح نہیں ہوئی جیسے کہ دیگر مسلم ممالک میں نظر آتی ہے اور نہ ہی ایسے تصورات کی بنیاد پر یہاں کوئی بڑے تنازعات سامنے آئے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہاں مذہب وریاست کے مابین تعلق ایک صحت مند شکل میں تسلیم شدہ امر ہے اور ریاست وسماج دونوں اس چیز کو بخوبی سمجھتے ہیں۔پھر یہ تعلق ایسی معتدل شکل میں ہے کہ نہ مذہب جدیدیت وثقافت کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور نہ جدیدیت وثقافت کے معیارات میں مذہب کو بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان ممالک میں مذہبی سیاسی جماعتوں کو باقاعدہ قانونی حیثیت حاصل ہے اور وہ بہت اثر ورسوخ کی حامل ہیں۔ ملائیشین اسلامک پارٹی 1951ء سے فعال ہے۔ اسی طرح انڈونیشیا میں نہضۃ العلماء جیسی مذہبی فلاحی سماجی جماعتیں بھی متحرک ہیں جو ملک کے قانونی ڈھانچے کے اندر رہ کر کام کرتی ہیں۔

2004ء کے انتخابات کے دوران یونائیٹڈ مالے آرگنائزیشن نے یہ نعرہ لگایا تھا: 'ترقی پسند اسلام' یہ دراصل ملائشین اسلامک پارٹی کے نعرے 'اسلام سب کے لیے' کا متبادل تھا۔ملائیشیا میں مسلم سیاسی جماعتوں کے مابین اس امر پہ صحت مند مقابلہ رہتا ہے کہ کون سیاسی حوالے سے مذہب کا ایسا تصور پیش کرتا ہے جو ترقی پسند ہو جمہوری ہو، جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ لوگوں کے معاصر مسائل میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہو۔ یونائٹد مالے کا یہ نعرہ لگانے کا مقصد یہی تھا کہ وہ اپنی حریف جماعت ملائیشین اسلامک پارٹی پر اپنی برتری ظاہر کرے۔اس نے اس شعار کی تبدیلی کے ساتھ یہ کہا تھا کہ

ملائیشین اسلام پارٹی محض علماء کی جماعت ہے جس کے پاس جدید ریاستی مشینری چلانے اور ترقی کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ملائیشین اسلام پارٹی ایسا ہی تصور نہضۃ العماء کے بارے میں پیش کرتی ہے اور خود سیاسی حوالے سے ترقی پسند اور زیادہ معتدل کہتی ہے۔

ملائیشیا کی آزادی کے بعد مہاتیر محمد کے دور کو ملک کی ترقی اور اس کی جدید بنیادوں پر استواری کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ مہاتیر محمد نے جہاں ملائیشیا کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا وہیں اس کے ساتھ ان کے عہد میں اسلامی تشخص پر بھی بہت زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ اسلامائزیشن کا یہ عمل ہر شعبے میں نظر آیا۔ تعلیمی نصاب میں مذہبی مواد کا اضافہ کیا گیا۔ اسلامی جامعات زیادہ سے زیادہ قائم کی گئیں۔ اسلامی بینکنگ نظام کو وسعت دی گئی۔ قومی میڈیا میں مذہبی پروگرامز شائع کیے گئے۔ معیشت کا ملائیشین ماڈل بھی اسلامی اقدار پر استوار کیا گیا۔ سرکاری سرپرستی میں اسلامی اقتصادیات کے تعارف وفروغ کے لیے مراکز قائم ہوئے۔ مذہبی شناخت واقدار کے تحفظ وفروغ کے لیے ایک پروگرام شروع کیا گیا جس کی براہ راست نگرانی وزیراعظم نے کی۔ جب میڈیا میں اسلامی پروگرامز کی زیادہ نشرواشاعت پر اعتراضات کیے گئے تو جواب دیا گیا ہے کہ یہ ملائیشیا کا قومیتی مسئلہ ہے جس میں مذہب اسلام کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ خارجہ سطح پر بھی اسلامی تشخص کو خاص جگہ دی گئی۔ مہاتیر محمد کے دور میں مشرق وسطی کے ساتھ بڑے بڑے اقتصادی معاہدے کیے گئے۔ انہوں نے مسلم حکمرانوں کو تلقین کی کہ وہ مغرب کی بجائے آپس میں باہمی تجارت پر زیادہ توجہ دیں اور ایک مضبوط مسلم بلاک تشکیل دیں۔ ابھی حال ہی میں جب مہاتیر محمد مختصر عرصے کے لیے ایک بار پھر ملائیشیا کے وزیراعظم بنے تو انہوں نے دسمبر 2019ء میں ایک کوالالمپور سربراہی کانفرنس کی میزبانی کی تھی جس میں مسلم حکمرانوں اور اہم مسلمان شخصیات کو دعوت دی گئی تھی تاکہ وہ ایک ایسے اتحاد کی بنیاد رکھ سکیں جس کے تحت مسلمان اپنے معاشی اور امن امان کے مسائل کو خود حل کر سکیں اور اسلاموفوبیا کا بھی رد کیا جاسکے۔

مہاتیر محمد کے دور میں اگرچہ اسلامی شریعت کے نفاذ کا اعلان تو نہیں کیا گیا تھا لیکن اسلامی تشخص

واقدار کے فروغ کو خاص اہمیت ملی۔ مفکرین کے نزدیک اس کی دو وجوہات تھیں جن کی اساس پر اتنے بڑے پیمانے پر اسلامی تشخص کو توجہ دی گئی، اور دونوں وجوہات میں یونائٹڈ مالے سے مسابقت رکھنے والی حریف اسلامی جماعت ملائشین اسلامک پارٹی کا اثر غالب تھا۔

ایک سبب یہ تھا کہ 80 کی دہائی میں ملائیشیا کے اندر اسلامی اقدار کی بات کرنے والی جماعتوں کا عروج تھا۔ بلکہ یہ وہ عہد تھا جب اسلام اور شریعت کی بات کرنے والی جماعتیں ساری دنیا میں طاقتور ہوئیں۔ اس وقت ملائشیا میں بھی ایسی تنظیمیں زیادہ فعال ہوئیں۔ ان میں ملائشین اسلامک پارٹی، مسلم یوتھ موومنٹ اور دارارقم جیسی جماعتیں سرفہرست تھیں۔ بالخصوص ملائشین اسلامک پارٹی جو یونائٹڈ مالے کی سیاسی قومی حریف تھی اسلامی تعلیمات واقدار کے فروغ کے لیے پہلے سے زیادہ فعال ہوگئی۔ مسلم یوتھ موومنٹ جو 1971ء میں قائم ہوئی تھی اس نے ملک کے اندر اسلامی نظام کے نفاذ کی آواز بلند کررکھی تھی اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کی بات کرتی تھی۔ ایسے میں یونائٹڈ مالے آرگنائزیشن نے اسلام سے اپنے تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے ملک میں اسلامائزیشن کے لیے خاطر خواہ اقدمات کیے۔ 1992ء میں جب ملائشیا کی ایک شمال مشرقی ریاست کیلانتن میں ملائشین اسلامک پارٹی کی حکومت تھی تو اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے ماتحت ریاست میں اسلامی نظام کے نفاذ کا ارادہ رکھتی ہے تو اس وقت مہاتیر محمد نے بھی اعلان کیا تھا کہ وہ ملائشیا میں شرعی نظام نافذ کریں گے۔ لیکن انہوں نے عملاً یہ قدم نہیں اٹھایا تھا۔

دوسرا عامل بھی تقریباً پہلے ہی کی طرح ہے۔ 80 کی دہائی میں جب مہاتیر محمد وزیر اعظم تھے تو ملائشین اسلامک پارٹی اور مسلم یوتھ موومنٹ جیسی جماعتوں نے یہ تاثر دینا شروع کیا کہ یونائٹڈ مالے ایک سیکولر رجحان کی حامل جماعت ہے جبکہ ملک کے قومی تشخص کی حقیقی نمائندہ جماعت کے لیے ملاوی نسل اور دین اسلام دونوں کو ترجیح دینا اہم ہے۔ تب یونائٹڈ مالے نے اپنے حوالے اس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ بلاشبہ مہاتیر محمد بذات خود اسلامی عنصر کو اہمیت دیتے تھے لیکن سیاسی مسابقت اور دباؤ نے بھی کئی اقدامات اٹھانے میں کردار ادا کیا۔ ملائشین اسلامک پارٹی نے اگرچہ ریاست کیلانتن میں شریعت اور حدود کے نفاذ کا اعلان کیا تھا لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہوسکا تھا کیونکہ

اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دستور میں کچھ ترامیم کرنی پڑتیں۔

ملائشین اسلامک پارٹی جو(PAS (Parti Islam-Se-Malaysia کے نام سے مشہور ہے یہ اگرچہ اسلامی تشخص کی سیاست کرتی ہے لیکن عملی سیاست میں اس نے غیر مسلموں اور خواتین کے حقوق کے لیے کافی نرمی کا اظہار کیا ہے۔1999ء میں جب ریاست ترینگانو میں جماعت کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے بہت سے ایسے اقدامات کیے جو اس کی سیاسی وسعت ظرفی کی علامت بنے۔اس نے مسیحی برادری کے لیے محدود چرچ بنانے کی شرط ختم کر دی اور انہیں آزادی دی کہ وہ آزادانہ طور پہ چرچ تعمیر کر سکتے ہیں۔اسی طرح چینی باشندوں کے لیے خنزیر پالنے اور اس کا گوشت کھانے بیچنے کی آزادی فراہم کی۔ ریاست میں نسلی امتیازی سلوک کو ختم کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ خواتین کے پارلیمان میں شراکت پر زور دیا۔ اپنی جماعت کے اندر بھی مرکزی سطح پر خواتین کی قیادت کو جگہ دی اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا۔

انڈونیشیا1945ء میں استعمار سے آزاد ہوا۔اس کا قومی شعار پانچ اصولوں پر قائم کیا گیا ہے جو یہ ہیں:

- حاکمیت الہیہ
- انسانی فلاح
- متحد انڈونیشیا
- جمہوریت
- عدالتِ اجتماعی

انڈونیشیا میں ان اصولوں پر تمام سیاسی جماعتوں اور مذہبی حلقوں کا اتفاق ہے۔ یہ اصول انڈونیشیا کے اتحاد اور اس کی ترقی کی ضمانت ہیں۔ان میں حاکمیت الہیہ کے ساتھ جمہوریت کو بھی شامل کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ریاست میں مذہب وسیاست کا تعلق معتدل حیثیت میں قائم رکھنا ممکن ہوتا ہے۔ اگرچہ انڈونیشیا میں جمہوریت اور اسلامی اقدار کے نفوذ کے لیے کوششیں مذہبی و جمہوری جماعتوں نے کیں لیکن آمریت کے عہد میں بھی وہاں اسلامی عنصر کو توجہ دی گئی۔

ملائشیا اور انڈونیشیا کے تجربات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب وریاست کے مابین ایک صحت مند تعلق قائم کیا جاسکتا ہے جس میں شہریت، جمہوریت اور جدیدیت کو بھی اہمیت دی جاسکتی ہے، اور اس کے ساتھ اسلامی اقدار کا تحفظ بھی ممکن ہے۔

انڈونیشیااور ملائشیا کے مذہبی ماڈل مختلف کیسے ہیں؟

شادی حامد[i]

ملائشیااور انڈونیشیامیں اسلامائزیشن

بات نظریے کی ہو یا عمل کی، اسلام اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ بہت سے مسلم معاشروں نے اس معاملے میں خاصی مزاحمت دکھائی ہے۔ مغرب میں یہ تصور اب راسخ ہو چکا ہے کہ مذہب کو سیاست کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے یعنی یہ کہ دینی تعلیمات کو بنیاد بنا کر ریاست کے امور انجام تک نہیں پہنچائے جا سکتے۔ اس حوالے سے سوچنے اور لکھنے والوں میں اختلاف رہا ہے۔ ترکی اور تیونس میں سیکولر عناصر نے دین کو سیاست سے الگ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مزاحمت اس قدر بڑھ گئی کہ اب یہ دونوں ممالک بہت سے معاملات میں حوالے کا درجہ رکھتے ہیں۔

دنیا بھر میں کسی بھی مذہب کو ریاستی امور انجام دینے کے معاملے میں کلیدی کردار کا حامل خیال نہیں کیا جاتا۔ لوگ دین اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں رکھتے ہیں۔ ہندوازم ہو یا بدھ ازم، عیسائیت ہو یا یہودیت، تمام ہی مذاہب یا ادیان کے پیروکار اس بات کو پسند نہیں کرتے یا زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ دین کو سیاسی امور میں مداخلت کا موقع دیا جائے۔ وہ دین کو سیاست سے اس قدر الگ رکھتے ہیں کہ اس فرق کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ متعدد ریاستوں میں اسلامی

---

[i] مصنف امریکا میں مقیم ہیں اور بین الاقوامی ادارے بروکنگز کے ساتھ منسلک ہیں۔ مسلم دنیا کی سیاست و سماج ان کا موضوع ہیں۔ یہ مضمون تحقیقات کے شمارے 'مسلم دنیا اور جمہوریت: تحدیات و امکانات' میں شائع ہوا۔

تعلیمات کو ریاستی امور کی انجام دہی اور قوانین پر موثر عمل یقینی بنانے کے لیے بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔ بعض مسلم معاشروں نے مزاحمت بھی کی ہے مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی دنیا مجموعی طور پر دین کو سیاست سے الگ رکھنے پر غیر متزلزل یقین رکھتی ہے۔ میں نے اپنی کتاب Islamic Exceptionalism میں اِسی نکتے پر بحث کی ہے یعنی یہ کہ اسلام اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کی تعلیمات کو بنیاد بنا کر قوانین مرتب کیے جاسکتے ہیں اور ریاستی امور کو بہتر طریقے سے انجام دیا جاسکتا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں اسلام اور سیاست کے تعلق کی جو بھی کیفیت ہے اُسے تسلیم تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ الگ بحث ہے کہ ہماری قبولیت کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

اگر کہیں مذہب اور سیاست کے درمیان تناؤ ہے تو وہاں جمہوریت کو لبرل ازم پر ترجیح دی جارہی ہے۔ لوگوں کو سیکولر یا لبرل بننے پر مجبور کرنے کی کوئی سبیل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ سراسر ان کی ترجیح اور پسند و ناپسند کا ہے۔ اگر لوگوں کو مجبور کیا جائے تو یہ امریکا میں دائیں بازو کا سرپرستانہ انداز سمجھا جائے گا۔ اگر اوباما کہتے ہیں کہ امریکا کے لوگ ایک خاص تناظر کے تحت لبرل اور ڈیموکریٹک ہیں تو پھر یہ بات ماننا پڑے گی کہ اردن، مصر یا پاکستان کے لوگ بھی ایک خاص تناظر میں وہ ہیں، جو وہ سیاسی طور پر ہیں۔

دنیا بھر میں لوگ اس بات سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ ان پر کوئی ماڈل مسلط کیا جائے گا۔ کسی بھی دوسرے معاشرے یا خطے کا کوئی سیاسی و معاشی ماڈل جوں کا توں اپنایا نہیں جاسکتا۔ ہر چیز اپنے حالات کی پیداوار ہوتی ہے۔ اگر کوئی ماڈل مسلط کیا جائے تو فطری طور پر مزاحمت تو کی ہی جاتی ہے۔ ہر طریقِ سیاست اور ہر سیاسی نظام کسی خاص پس منظر کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ بہت سے ممالک میں ترکی کو ایک ماڈل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر اس حوالے سے خوفزدہ رہنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ترک ماڈل میں کچھ لوگوں کے لیے اگر تحریک تھی تو کچھ دوسرے لوگوں کے لیے تھوڑی بہت مایوسی بھی تھی۔

ملائشیااور انڈونیشیا کے مذہبی ماڈل کی خصوصیات

اسلامی دنیا میں مشرق وسطی سے بھی ہٹ کر بعض اچھی مثالیں اور نمونے موجود ہیں۔ انڈونیشیااور ملائیشیا کو اس حوالے سے روشن مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں معاشروں میں رواداری بھی ہے، شائستگی بھی اور دوسروں کو خوش دِلی سے قبول کرنے کا جذبہ بھی۔ ان دونوں ممالک میں اُردن، تیونس اور مراکش سے زیادہ شرعی قوانین و ضوابط موجود اور نافذ ہیں۔ بیشتر معاملات میں اُنہوں نے شریعت کے اصول اپنائے ہیں۔

انڈونیشیا کے اسکالر رابن بش کہتے ہیں کہ انڈونیشیا کے قدامت پسند علاقوں میں شرعی اصولوں پر مرتب کیے جانے والے قوانین اور ضوابط نافذ ہیں۔ طالبات اور سرکاری ملازمت کی خواہاں خواتین کے لیے اسکارف لازم ہے۔ جامعہ میں داخلے اور شادی کے اندراج کے لیے لازم ہے کہ چند قرآنی آیات سنائی جائیں۔ جکارتہ میں قائم واحد انسٹی ٹیوٹ نے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ انڈونیشیا میں یہ لازم نہیں کہ اسلامی قوانین پر وہی جماعتیں زور دیں جو اسلام کی بات کرتی ہیں بلکہ سیکولر جماعتیں بھی اسلامی قوانین پر عمل کو اہمیت دیتی ہیں۔ مثلاً جن صوبوں میں گولکر جیسی سیکولر جماعت کی پوزیشن مستحکم ہے وہاں بھی اسلامی قوانین کے نفاذ ہی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے تادیبی کردار کے لیے قبولیت موجود ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں اسلام قوانین کے ذریعے بھی موجود اور متحرّک رہے۔ سیاسی جماعتوں کے نظریات اور پالیسیاں اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ زندگی میں اسلام چاہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سیاسی جماعتیں بھی مذہب کو نظرانداز کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔

ایسا کیونکر ممکن ہوا؟

ایسا نہیں ہے کہ انڈونیشیااور ملائیشیا میں اسلام کا نفاذ کوئی چھوٹا مسئلہ تھا۔ ایک بنیادی سہولت البتہ یہ تھی کہ مذہب سیاست میں لانے سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل موجود تھااور ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات پر عمل سے دورِ حاضر میں یقینی طور پر چند ایک مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے

کہ اب بگاڑ بہت بڑھ گیا ہے۔ دین کی تعلیمات بگاڑ کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔ جن کا مفاد بگاڑ کے برقرار رہنے سے وابستہ ہے وہ تو لازمی طور پر مزاحمت ہی کریں گے۔ کسی بھی بگاڑ کو دور کرنے میں ہر مذہب کی تعلیمات کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگوں کے لیے ذاتی مفادات ترک کرنا آسان نہیں ہوتا۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں آسانیہ رہی ہے کہ معاشرہ اسلامی تعلیمات کو دبوچنے یا محدود کرنے کے بجائے بہت حد تک انہیں قبول کرنے پر آمادہ تھا۔

عرب دنیا اور دیگر اسلامی ممالک میں اشرافیہ نے ہمیشہ اس بات کی مخالفت کی ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو سیاست کے میدان میں لا کر قوانین کی تشکیل و تنفیذ میں کوئی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ وہ اسلامی تعلیمات کو صرف عبادات اور مساجد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی لوگ علمائے کرام سے خطاب سنیں اور مطمئن ہو رہیں۔ یہی سبب ہے کہ شرعی قوانین کی تشکیل اور نفاذ کی نہ صرف یہ کہ حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی بلکہ باضابطہ مخالفت کی جاتی ہے، اس راہ میں روڑے اٹکانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ مجموعی کیفیت یہ ہے کہ جہاں ضروری ہو وہاں دین کو گلے لگایا جاتا ہے اور جہاں اپنے یعنی ذاتی مفادات پر ضرب پڑتی ہو وہاں دین کو خیر باد کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جاتی۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں ایسا نہ تھا۔ دونوں ممالک میں عوام اسلام کو عملی زندگی میں بھی قبول کرنے کے لیے اس قدر تیار تھے کہ اشرافیہ میں شرعی قوانین کے خلاف جانے کی ہمت پیدا نہ ہوئی۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک میں اسلام کی بات کرنے والی سیاسی جماعتیں بہت مضبوط ہیں۔ ان میں آپس کی کشمکش ہی ختم نہیں ہوتی۔ وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے رہتے کمزور ہو جاتی ہیں۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں ایسا نہ تھا۔ ان دونوں ممالک میں اسلام کا پرچم لے کر چلنے والی جماعتیں بہت مضبوط نہ تھیں اور پھر اسلام کی بات کرنے کا مکمل اختیار چند ایک سیاسی جماعتوں کے پاس نہ تھا۔ ہر جماعت اسلامی قوانین کی حامی تھی۔ اسلام کی بات کرنے والوں کو سیکولر عناصر سے مدد درکار تھی، اور سیکولر عناصر سے اسلام پسند افراد تعاون کرتے تھے۔ عوام میں پائی جانے والی قدامت پسندی ان دونوں سیاسی عناصر کے درمیان رابطے کا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ خاص بات یہ

ہے کہ دونوں ہی ممالک میں قدامت پسندی خاصی غیر متنازع رہی ہے۔ اس میں انتہا پسندی آئی نہ تشدد۔ یہی سبب ہے کہ قدامت پسندی کو قبول کرنے میں کبھی کسی نے کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔

جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام عملی سطح پر سیاست کا حصہ ہے۔ اسلامی قوانین محض وضع نہیں کیے جاتے بلکہ ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ مگر مغرب میں اس معاملے پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اسلامی دنیا میں اسلامی تعلیمات اور قوانین پر عمل کی بات سے بدکنے والے مغرب کو جنوب مشرقی ایشیا میں اسلامی قوانین پر عمل سے کوئی خاص چڑ نہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مغرب کی اجتماعی حکمت عملی میں یہ خطہ زیادہ اہم نہیں۔ اور اس خطے میں رونما ہونے والے واقعات سے باقی اسلامی دنیا میں کوئی بڑی تبدیلی بھی رونما نہیں ہوتی۔

انڈونیشیا اور ملائیشیا میں عوام نے اسلام کو اپنی زندگی میں عملی سطح پر قبول کر لیا ہے۔ وہ اسلام کے وسیع تر کردار کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں اب تک ایسا نہیں ہو پایا ہے۔ لوگ اسلام کی باتیں تو بہت کرتے ہیں مگر اسے اپنی زندگی میں عملی سطح پر قبول کرنے اور اپنانے کے لیے تیار نہیں۔

مذہبی سفارت کاری[i]

خورشید ندیم

مذہبی سفارت کاری کیا ہے؟

ایک وقت تھا جب سفارت کاری حکومت کا کام ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے خصوصی وزارت بنائی جاتی تھی، جو ممالک کے درمیان باہمی یا پھر عالمی معاملات پر بات کرنے کی مجاز تھی۔ جمہوریت نے ریاستی امور میں عوام کے کردار کو اہم قرار دیا تو ان امور میں بھی عوامی شمولیت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ عوام کو اب براہِ راست بھی سفارت کاری کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ اس کو 'پبلک ڈپلومیسی' کہا گیا۔ مختلف طبقہ ہائے حیات کے نمائندہ افراد دوسرے ممالک کے انہی طبقات کے نمائندوں سے ملنے لگے۔ ادیب ادیب سے، فنکار فنکار سے۔ سفارت کاری اصلاً دو ممالک کے عوام کا ایک دوسرے کے قریب جانے کا نام ہے۔ عوام اس کام میں اب براہِ راست شریک ہو گئے۔

'مذہبی سفارت کاری' عوامی سفارت کاری کی توسیع ہے۔ اس کا تعلق ان سماجی طبقات سے ہے جو مذہب کے دائرہ میں متحرک ہوتے ہیں۔ یہ علما ہو سکتے ہیں اور غیر حکومتی اداروں کے نمائندے بھی۔ مذہب چونکہ قوموں کے اجتماعی امور میں مستقل کردار ادا کر رہا ہے جسے کم نہیں کیا جا سکا، اس لیے 'مذہبی سفارت کاری' کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہے کہ مذہب کے نام پر اقوام کے مابین بڑھتے فاصلوں کو کم کیا جائے اور مذہب افتراق کے بجائے، اشتراک کی قوت کے طور پر سامنے آئے۔ پبلک ڈپلومیسی، مذہبی سفارت کاری جس کا حصہ ہے، حکومتی سفارت کاری

---

[i] بشکریہ: روزنامہ دنیا

ہی کی توسیع ہے۔ یہ عمل وزارتِ خارجہ سے ماورا نہیں' اس کے دائرے ہی میں ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ حکومت اور عوام کی سطح پر وحدتِ فکر ہی دوسری اقوام کے سامنے آئے۔

برادرم اسرار مدنی نے اس میدان میں قدم رکھا تو نئے اُفق دریافت کیے۔ وہ ایک دفعہ علما اور عوامی سطح پر متحرک مذہبی راہ نماؤں کو چین لے گئے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ وہاں مسلمانوں کی ثقافت کیسی ہے اور ایک غیر مذہبی ریاست کے شہری ہوتے ہوئے وہ اپنے مذہب پر کیسے عمل کر رہے ہیں۔ میں نے اس وفد کے شرکا کے تاثرات جانے تو مجھے اندازہ ہوا کہ مذہبی سفارت کاری کی اہمیت کیا ہے۔

گزشتہ دنوں اسرار مدنی صاحب ایک وفد انڈونیشیا بھی لے گئے۔ اس میں سیاسی جماعتوں' سول سوسائٹی اور علما کی بھرپور نمائندگی تھی۔ پنج پیر سے مولانا محمد طیب طاہری' جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک سے مولانا راشد الحق اور جامعہ بنوریہ عالمیہ کے منتہم مفتی نعمان نعیم بھی وفد میں شامل تھے۔ مولانا محمد طیب' مولانا طاہر پنج پیری کے صاحب زادے ہیں۔ مولانا طاہر کا وسیع حلقۂ اثر ہے جس کا دائرہ پاکستان کے ساتھ افغانستان کو محیط ہے۔ ہزاروں مدارس ان سے وابستہ ہیں۔ دین کی تدریس کے باب میں' وہ اپنے استاد مولانا حسین علی کے منہج کو اپنائے ہوئے تھے۔ مولانا حسین علی کے ہاں قرآن مجید کو مرکزیت حاصل رہی اور انہوں نے عقیدہ و عمل میں ہمیشہ قرآن ہی کو میزان تسلیم کیا۔

مولانا راشد الحق' مولانا سمیع الحق کے صاحب زادے ہیں۔ یہ گھرانہ بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مفتی نعمان نعیم' مفتی نعیم مرحوم کے صاحب زادے ہیں۔ مذہبی سفارت کاری کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ ان کے مدرسے میں انڈونیشیا کے تین سو طالب علم اِس وقت زیرِ تعلیم ہیں۔ یہ طالب علم فراغت کے بعد انڈونیشیا میں پاکستان کے غیر رسمی سفیر ہوں گے۔ مستقبل میں یہ اپنی حکومت میں کسی اہم منصب پر فائز ہو سکتے ہیں اور اس طرح دو ملکوں کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوں گے۔ افغانستان میں انہی طالب علموں کی وجہ سے مولانا سمیع الحق کا وسیع حلقۂ اثر تھا۔ جب ان کے شاگرد افغانستان کے حکمران بنے تو خیال ہوا کہ ان کی وجہ سے باہمی تعلقات اچھے ہو جائیں گے۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو ممکن تھا کہ وہاں کی حکومت کے ساتھ مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کیا جا سکتا۔

مذہبی سفارت کاری کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایک دوسرے کے تجربات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ سیکھنا اس کے بعد کا مرحلہ ہے۔ انڈونیشیا اس کی ایک مثال ہے۔ انڈونیشیا کے بارے میں میں برسوں سے لکھ رہا ہوں۔ وہاں کی آبادی کا 87 فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ آبادی کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے۔ وہاں دنیا کی سب سے بڑی مسلمان تحریکیں ہیں۔ ہم نے ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے وہ بنیادی مسائل بہت اچھی طرح حل کر لیے ہیں، ہم برسوں سے جن میں الجھے ہوئے ہیں۔ نہ سیکھنے کی ایک بڑی وجہ ہماری لاعلمی ہے۔

پاکستان کی مذہبی جماعتوں اور طبقات نے عرب کے علما اور تحریکوں سے رابطہ رکھا یا امریکہ اور یورپ کے سکالرز سے۔ یہاں کسی کو خبر ہی نہیں کہ انڈونیشیا میں مسلمان علما کا کردار کیا ہے۔ ریاست و سیاست کے باب میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ ہم حج عمرے پر جاتے ہیں تو ہمیں سب سے منظم گروہ انڈونیشیا کے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نظم ان میں کیسے آیا؟ یہ دراصل وہاں کی بڑی مذہبی جماعتوں نہضۃ العلما اور محمدیہ کی محنت ہے۔ ان کا الازہر وغیرہ سے گہرا رابطہ ہے لیکن ہم اس سے بے خبر ہیں۔

گزشتہ بیس سال سے میرا احساس یہ ہے کہ ہمارے لیے اگر سیکھنے کو کچھ ہے تو وہ آج کے مشرقِ وسطیٰ و مغرب میں کم اور انڈونیشیا میں زیادہ ہے۔ عرب دنیا میں مذہب سمیت ہر شے ریاست کے کنٹرول میں رہی ہے۔ وہاں نئے افکار کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ مصر میں جو کچھ ہے، اس کا بہتر علمی بیان خود ہمارے ہاں موجود ہے۔ مصر تو اس معاملے میں ہمارا مقلد ہے۔ مراکش میں قدرے بہتر حالات ہیں مگر وہاں بھی ریاست کا کنٹرول موجود ہے۔

انڈونیشیا میں جمہوریت ہے۔ اسی وجہ سے وہاں مسلم فکر کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود اسلام کے فروغ اور اشاعت کے لیے جمہوریت کتنی بڑی نعمت ہے۔ انڈونیشیا کے اہلِ علم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور مقامی حالات کی رعایت سے اسلام کی ایسی تعبیر پیش کی جس کی وجہ سے مسلم سماج اپنے دین سے دور نہیں ہوا۔ ساتھ ہی اس نے اس صلاحیت کا عملی ثبوت پیش کیا کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بھی اسلام ایک رحمت ہے۔ وہاں کی بڑی مذہبی جماعتیں، سول سوسائٹی کے ساتھ مل کر 'اسلام بطور رحمۃ للعالمین' کے ایک بڑے پراجیکٹ پر کام کر رہی ہیں۔

پاکستان کے علمااور مذہبی طبقات کاان تجربات سے واقف ہونا ازبس ضروری ہے۔

اسرار مدنی صاحب نے بروقت اس کمی کو محسوس کیااور پھر اسے پورا کرنے کی کوشش کی۔ وہ خود دینی مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں۔ پاکستان کے مسلم سماج کو درپیش مسائل کا بہتر ادراک رکھتے ہیں۔ آج ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دین کو سمجھتے ہوں اور اس کے ساتھ جدید مسائل کو بھی۔ مدنی صاحب کا ادارہ پاکستان کو ایک بہتر سماج بنانے کی شعوری کوشش کر رہا ہے۔ مذہبی سفارت کاری اسی کوشش کا ایک جزو ہے۔ اگر ایسا ممکن ہو کہ ہمارے یہ علما انڈونیشیا کا سفر نامہ لکھیں یا اپنے اپنے ادارے میں اساتذہ اور طالب علموں کو اپنے مشاہدات اور تجربات سے آگاہ کریں تو ان کا یہ سفر نتائج کے اعتبار سے زیادہ مفید ہو جائے گا۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ لازم نہیں کہ ہم انڈونیشیا کے علما کی ہر رائے سے اتفاق کریں لیکن اس کو جاننا بہت ضروری ہے۔ اس سے ہمیں اس کا ادراک ہو گا کہ ختمِ نبوت کے بعد کسی کا قول فی نفسہٖ واجب الاتباع نہیں۔ اہلِ علم اختلاف کریں گے اور ہمیں اتفاق و عدم اتفاق سے ماوراان کی رائے کا احترام کرنا ہے۔ اس عمل کے جاری رہنے ہی میں برکت ہے۔

اسلام-رحمت اللعالمین: انڈونیشیا میں تعبیرِ دین کے اُصول

بیرسٹر ظفراللہ خان[i]

'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' نے جب مجھے اپنے ایک مذہبی سفارت کاری کے پروگرام کے ضمن میں انڈونیشیا کے سفر کی دعوت دی تو میں نے حسب مزاج انہیں جواب دیا کہ میری روحانی ڈیوٹی مغربی ممالک کی طرف ہے اور میں مشرق کی طرف میلان نہیں رکھتا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مشرق میں موسم اور خوراک عجیب ہے اور تاریخی لحاظ سے سیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کے اصرار پر میں تیار ہو گیا۔ کچھ دوست بھی جا رہے تھے اور انڈونیشیا سے پاکستان کی بھی مماثلت ہے کہ وہاں بھی سماجی انتشار رہا ہے اور غیر جمہوری طاقتوں نے طویل حکمرانی کی ہے جبکہ اب وہاں سماجی آہنگی مثالی ہے۔ جمہوریت ہے اور انڈونیشیا دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ انڈونیشیا کا یہ سفر ہم نے ایک گروپ کی شکل میں کیا جس میں علمائے کرام، سیاست دان اور سول سوسائٹی کے نمائندے شامل تھے اور اس دورہ میں حکومت انڈونیشیا نے خوب سہولت کاری کی۔

انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا مسلمان ملک ہے۔ اس کی آبادی 28 کروڑ ہے جبکہ دنیا میں آبادی کے لحاظ سے چوتھا بڑا ملک ہے۔ یہ ملک 17000 جزیروں پر مشتمل ہے جس میں جاوا اور سماٹرا سب سے بڑے ہیں۔ انڈونیشیا مین 1300 نسلی گروہ رہتے ہیں جبکہ 200 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس کی آبادی کا 87 فیصد مسلمان ہیں جبکہ 10.5 فیصد عیسائی ہیں اور 1.7 فیصد اور 0.7 فیصد بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ اس لسانی، علاقائی اور مذہب اختلاف میں متحد انہوں نے ایک راہنما اصول بنا رکھا ہے، وہ ہے کثرت میں وحدت۔

---

[i] بیرسٹر ظفراللہ خان سابق وزیر قانون رہ چکے ہیں، تصوف، اصول فقہ اور سیاسی اسلام پر متعدد اہم کتب کے مصنف بھی ہیں۔

انڈونیشیا اگست 1945ء میں آزاد ہوا۔ اس سے پہلے وہاں نیدرلینڈ نے کئی سو سال بطور استعمار حکومت کی اور پھر آخری دو سال جاپان نے وہاں قبضہ کر لیا تھا۔ انڈونیشیا کے پہلے صدر جناب سکارنو تھے جبکہ 1968ء میں جرنل سہارتو نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانہ میں کمیونسٹوں اور دیگر سیاسی جماعتوں اور گروہوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس میں پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ 1998ء میں پھر وہاں جمہوریت قائم ہو گئی اور ملک معاشی اور سماجی ترقی کی طرف گامزن ہو گیا۔ ملک میں صدارتی نظام ہے۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں جبکہ صدر کا براہ راست انتخاب ہوتا ہے۔ انڈونیشیا دنیا کی سولہویں بڑی معیشت ہے جبکہ فی کس آمدنی 5100 ڈالر ہے جبکہ پاکستان کی معیشت چھیاسویں نمبر پر ہے جبکہ اس کی فی کس آمدنی 1470 ڈالر ہے۔

انڈونیشیا میں اسلام عرب تاجروں کی مدد سے پھیلا اور پھر تیرھویں صدی سے صوفیائے کرامؒ نے اثر ڈالنا شروع کیا جو زیادہ تر ہندوستان (گجرات) اور یمن (حضر موت) سے تشریف لائے تھے۔ انڈونیشیا ایک سیکولر ریاست ہے جس نے رسمی طور پر چھ مذاہب کو تسلیم کر رکھا ہے۔ بعض احوال کے مطابق تیرھویں صدی میں شمالی سماٹرا میں ایک مقامی مسلم سلطنت قائم ہو گئی تھی۔

انڈونیشیا مسلم دنیا کا ایک ایسا ملک ہے کہ جس کے بارے میں مفکرین اکثر گفتگو کرتے رہتے ہیں اور اس کو ایک ماڈل کے طور پہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ وہاں کی تعبیرِ دین عام مسلم ممالک، خصوصاً برصغیر سے کئی پہلوؤں میں مختلف ہے۔ اس بابت ہمیں پہلے ہی بہت سی چیزوں علم تھا۔ پھر چونکہ یہ دورہ خصوصی طور پہ وہاں کے دینی ڈھانچے کو قریب سے دیکھنے اور براہ راست ان کی مذہبی قیادت، اہم جماعتوں اور اداروں کا جائزہ لینے کے لیے تھا، اس لیے بھرپور استفادے کا موقع ملا اور مزید کچھ ایسے پہلو تجربے سے گزرے جن کا ذکر کرنا مفید محسوس ہوتا ہے۔ پہلے کچھ احوال کو بیان کرتے ہیں تاکہ دینی تعبیر کی عملی شکل سمجھ میں آجائے تو پھر اس کے فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

1- وسعت نظری کے مظاہر

جب ہم نے شہر میں ٹیکسی کی تو ڈرائیور خاتون ہے، جو نہایت باقار اور پردے کی حالت میں تھی۔ وفد

میں پاکستان کے دو تین دینی مدارس کی اہم شخصیات بھی ہمراہ تھیں۔ جب اس خاتون نے ہمیں گاڑی میں لے کر ہوٹل چھوڑا تو میں نے اُن علماء سے پوچھا کہ کیا اس سے کوئی مسئلہ یا قباحت پیدا ہوئی ہے؟، تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوا، ان خاتون کا عمل بہت باوقار اور حدود کے اندر تھا۔ ایسے ہی جب ہمیں بعد میں انڈونیشیا کے سب سے بڑی مذہبی جماعتوں نہضۃ العلماء اور محمدیہ کے دفاتر اور اداروں میں جانا ہوا تو وہاں بھی ہم نے دیکھا کہ ان کے انتظامی اور علمی شعبوں میں تقریباً آدھا عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ بلکہ جن رضاکاروں نے ہمیں چائے وغیرہ پیش کی ان میں بھی خواتین شامل تھیں۔

اس کے علاوہ جب مساجد میں نماز ادا کرنے جاتے تو وہاں پیچھے خواتین نمازی بھی شریک ہوتی تھیں، اور یہ ایک معمول کی بات تھی۔ وہاں پر خواتین مساجد میں بہ کثرت دیکھنے کو ملتی ہیں، کہیں کہیں تو ان کی تعداد مردوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حال ماہ رمضان میں تراویح کے لیے بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص لباس میں مساجد آتی ہیں اور تراویح ادا کرتی ہیں۔ مساجد میں مردوں اور عورتوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ ہوتا ہے، اور پیچھے ان کی لمبی قطاریں ہوتی ہیں۔ مساجد سے متعلقہ انتظامات میں بھی وہ حصہ لیتی ہیں۔ انڈونیشیا میں مذہبی معاملات و تبلیغ کے شعبوں میں خواتین کی فعالیت حیران کن حد تک وسیع ہے۔ معاشرے نے اسے قبول کیا ہوا ہے اور وہاں پر یہ چیز نارمل ہے۔ ان کی یہ سوچ وہاں کی مذہبی تعبیر سے ہی پھوٹتی ہے۔

جب ہم نے معاشرے کے ہر شعبے میں خواتین کی معمول کی شراکت کو دیکھا اور ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ یہ دراصل ان کی مذہبی تفہیم تھی کہ اللہ تعالی نے جو کچھ مرد کے لیے بنایا ہے، وہی خواتین کے لیے بھی بنایا ہے۔ اصول کے طور پہ دونوں اصناف میں برابری ہے۔ ان کے مطابق، اگر مرد کما رہا ہے اور روزی رزق کا انتظام سنبھالتا ہے اور خاتون اس پہ انحصار کرتی ہے تو مرد 'قوام' ہے، اور اگر خاتون کماتی ہے اور مرد اس پر انحصار کرتا ہے تو ایسی صورت میں خاتون قوام سمجھی جائے گی۔ یہ تعبیر ہمارے لیے بہت عجیب اور نئی تھی۔

یہ تو مذہبی اداروں میں خواتین کی سماجی فعالیت و شراکت کا پہلو تھا، جس پر ہم آگے مزید کچھ عرض

کریں گے۔اِن مذہبی جماعتوں کے دفاتر اور ہیڈ آفسز میں جب ہم نے ان کی قیادت سے ملاقاتیں کیں تو ایک مشترک امر یہ دیکھنے کو ملا کہ کرسی کے پیچھے دیوار پر انڈونیشیا کے صدر اور نائب صدر کی تصاویر آویزاں تھیں۔یعنی کہ ملک کے مرکزی دھارے کی مذہبی جماعتوں کے اداروں اور دفاتر میں ریاست کے سربراہان کی اہمیت اور حیثیت کو اسی طرح تسلیم کیا گیا تھا اور انہیں تکریم دی گئی تھی جس طرح ان کے عام سرکاری اداروں میں ہوتا ہے۔کم از کم ہمارے یہاں کے مذہبی اداروں اور جماعتوں کے دفاتر میں یہ تصور بھی نہیں ہے کہ وہ ریاست کے سربراہان کی تصاویز آویزاں کریں۔اول تو کوئی بھی تصویر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اسے جائز نہیں سمجھتے یا اگر کہیں ہوگی تو اپنے علماء کی تصویر لگائیں گے۔

اس دورہ میں ہمیں انڈونیشیا این جی او فورم آن انڈونیشیا ڈیویلپمنٹ (INFID) سے شرف میزبانی بخشا۔یہ ادارہ بہت سے این جی اوز کا مشترکہ فورم ہے جو 1985ء میں قائم ہوا تھا جس کے بنانے میں نھدۃ العلماء کے لیڈر جناب عبدالرضی واحد (دس گر) جو انڈونیشیا کے چوتھے صدر (2021ء-2019ء) سے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس نے ملک میں جمہوری اقدار، مساوات، سماجی انصاف اور حقوق انسانی کے لیے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ائیر پورٹ سے چیکنگ کے بعد جب ہم ہوٹل پہنچے تو ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ہم ہوٹل میں موجود مصلیٰ میں چلے گئے۔انڈونیشیا میں مساجد دو طرح کی ہیں۔ایک بڑی جامع مسجد جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے جبکہ دوسری چھوٹی چھوٹی مساجد / کمرے جو ہر ہوٹل وغیرہ میں ہوتے ہیں جہاں لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ان کو مصلیٰ کہتے ہیں۔جب ہم وہاں گئے تو اس مصلیٰ میں جماعت ہو رہی تھی جبکہ پانچ چھ لڑکیاں بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔مصلیٰ (مسجد) میں نوجوان خواتین کی زیادہ تعداد دیکھ کر حیرانی اور خوشی بھی ہوئی۔میں ان سے ملا۔ان میں سے ازکا اننکا نے کہا وہ INFID کی طرف سے ہیں جو ہماری میزبان ہیں۔میرے لیے دوسری حیرانی یہ تھی کہ این جی او کی لڑکیاں مصلیٰ/مسجد میں نماز پڑھنے آئی ہوئی تھیں جس کا پاکستان میں رواج نہیں ہے۔

پاکستان کی این جی اوز کے لوگ زیادہ تر آزاد خیال ہیں جن کا مذہب کی طرف میلان نہ ہونے کے برابر ہے۔جب یہ پروگرام شروع ہوا تو یہی لڑکی سٹیج سیکریٹری تھی۔اس پروگرام میں دو خواتین علما نے

اپنی تقاریر کیں اور سوالوں کے جواب دیے۔ مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ پاکستان کی طرح انڈونیشیا میں مذہبی لوگوں اور این جی اوز غیریت نہیں ہے بلکہ باہمی اشتراک ہے اور مذہبی لوگوں نے بھی بہت سی این جی اوز بنا رکھی ہیں جو بہت زیادہ متحرک ہیں اور انہیں حکومت کی بھی سرپرستی اور مالی امداد حاصل ہے۔

اس تنظیم نے ہمیں بتایا کہ

(1) عالم سے مراد وہ شخص ہے جو علم کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی اور اجتماعی عمل میں تقویٰ رکھتا ہو اور اپنے عمل کو رحمۃ اللعالمین کے تصور کو عملی جامہ پہنانے میں کوتاہی نہ ہو جبکہ ہمارے ہاں کردار کے تقویٰ کو عالم کی تعریف میں شامل نہیں کیا جاتا۔

(2) خاتون عالم کی تعریف نظریہ کی بنیاد پر کی جاتی ہے نہ کہ جنس کی بنیاد پر۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مرد عالم جو خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کرے وہ خاتون عالم کی تعریف میں شامل ہے۔ یہ کسی بھی چیز کی تعریف کے لیے ایک نئی جہت ہے۔ ہم اس سے سیکھ سکتے ہیں۔

(3) خواتین علما کونسل ایک دینی، سماجی، ثقافتی اور روحانی تحریک ہے۔ پاکستان میں اس طرح کی جامعیت مفقود ہے۔ ہمیں اس سے سیکھنا چاہیے۔

(4) ان کی سوچ اسلامی، انسانی، قومی اور عالمی ہے۔

(5) اس تحریک کے نو اصول ہیں (i) : توحید، (ii)رحم دلی، (iii)انسانی مفاد، (iv) برابری، (v) باہمی تعاون، (vi)عدل، (vii) قومیت، (viii)انسانیت اور (ix) عالمیت

ان کے پروگرام میں شامل ہے: (i) خواتین کو ماحولیاتی آلودگی سے بچانا، (ii) خواتین کو جبری شادی سے بچانا، (iii)خواتین کو جبری حمل سے بچانا وغیرہ

نہضۃ العلماء اور محمدیہ (جو علماء کی سب سے بڑی تنظیمیں ہیں) کے سربراہان کی داڑھی نہ تھی، بلکہ وہ

پتلون شرٹ میں ہوتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہم امام شافعی کے پیروکاروں میں سے ہیں، اور امام شافعی کے نزدیک داڑھی سنن عادیہ میں سے ہے۔

ایک اور چیز یہ نظر آئی کہ وہ مساجد میں جمعہ کی اذان کے ساتھ دف بجاتے تھے۔ جس طرح پرانے زمانے میں مذہبی مواقع اور ثقافتی تہواروں پر دف بجائی جاتی تھی، یہ چیز انڈونیشیا میں اب بھی زندہ ہے۔ وہ مساجد کے اندر دف بجانا سکھاتے بھی ہیں۔ جب ہم نے علماء سے اس بارے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ عمل جائز ہے، بلکہ مدینہ کی ریاست میں عام تھا۔

مزید حیران کن صورتحال اس وقت دیکھنے کو ملی کہ جب ان مذہبی اداروں کے پروگرامز میں شرکت کے لیے ہمیں مدعو کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان مجالس میں اقلیتی گروہوں کے گروہ کے افراد بھی شریک تھے۔ وہ بھی باقی لوگوں کی طرح آئے، ان سے بات چیت کی گئی اور جب نشست کا اختتام ہوا تو وہ چلے گئے۔

مذکورہ بالا چند مثالیں یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ انڈونیشیا کے علماء کا تفہیمِ دین اس سے بالکل مختلف ہے، جو برصغیر میں پایا جاتا ہے۔ ان سے اس پر جب مکالمہ ہوتا تو وہ بتاتے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین اسلام رحمۃ للعالمین ہے۔ یہ دین دنیا کے تمام انسانوں اور طبقات کے لیے برابر طور پہ رحمت ہے، اور دین میں توسع ہے۔ انڈونیشیا کے عوام میں مذہبی مظاہر بہ کثرت دیکھنے کو ملتے ہیں، وہ اسی طرح دین کے ارکان ادا کرتے ہیں جیسے ہم کرتے ہیں۔ نماز، روزے کی پابندی کرتے ہیں۔ حج کے لیے بہت اہتمام سے اور منظم ہو کر جاتے ہیں۔ دینی لحاظ سے وہ سب مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں جو معروف ہیں، مگر اس کے ساتھ ان میں توسع اور تکثیریت پسندی کا عنصر بھی واضح نظر آتا ہے۔ ہم نے ان کا لٹریچر دیکھا اور پروگرامز میں انہوں نے تفصیلات سامنے رکھیں کہ وہ اپنے معاشرے میں یہ چیز کس طرح لے کر آئے اور کیا کیا اقدامات کیے تو جو پہلو ہمارے سامنے آئے، ان پر ذرا اختصار کے ساتھ بات کر لیتے ہیں۔

2- دینی جماعتوں کا منہج

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انڈونیشیا کی دونوں بڑی مذہبی جماعتیں نہضۃ العلما اور محمدیہ، دونوں انتخابات میں حصہ نہیں لیتیں۔ حالانکہ ان دونوں جماعتوں کے ملک میں سات کروڑ رجسٹرڈ ممبر ہیں۔ شروع میں تو یہ دونوں جماعتیں سیاست میں حصہ لیتی تھیں، مگر بعد میں عدم اطمینان اور فلاحی کاموں کے متاثر ہونے کی وجہ سے براہ راست سیاست سے راہیں جدا کر لیں اور اعلان کیا کہ وہ اپنی مذہبی، علمی و سماجی خدمات پر توجہ مرکوز رکھیں گی۔ اب جماعت کا کوئی بھی فرد اگر انتخابات میں حصہ لینا چاہے تو اسے جماعت کی رکنیت سے استعفی دینا پڑتا ہے۔ عبدالرحمان واحد جو نہضۃ العلما کے سربراہ بھی رہے اور ہاشم اشعری جنہوں نے جماعت کی بنیاد رکھی تھی کے پوتے تھے، انہوں نے 1999 میں جب صدارتی انتخابات میں حصہ لینا چاہا تو پہلے جماعت کی رکنیت سے علیحدگی اختیار کی۔ چونکہ جماعت کے رکن کروڑوں کی تعداد میں ہیں اس لیے وہ جیت بھی گئے۔ وہاں علما یہ کہتے ہیں کہ ہمارا کام سیاست نہیں ہے۔ علما کے بنیادی طور پہ دو کام ہوتے ہیں۔ ایک ہے تعلیم و تربیت اور اخلاقی و روحانی تزکیہ کرنا، اور دوسری ذمہ داری ہے سماجی و فلاحی امور میں حصہ ڈالنا۔ یہ دونوں جماعتیں اسی فریضے کو ادا کر رہی ہیں اور ان کا سارا ڈھانچہ دو حصوں میں تقسیم ہے، تعلیمی و تربیتی، اور فلاحی امور۔

ایک پروگرام میں ڈاکٹر عالمی قبطیہ نے مذہبی رواداری کی ترویج میں خواتین کا کردار پر بات کی۔ آپ نے دینی تعلیم انڈونیشیا میں حاصل کی۔ اس کے بعد نفسیات میں ایم اے کیا اور پھر امریکہ سے پی ایچ ڈی کیا اور آسٹریلیا میں صنفی علوم کی پروفیسر ہیں اور آج کل قومی کمیشن برائے تدارک تشدد کی کمشنر ہیں۔ آپ محمدیہ تحریک کی طرف سے مفتی بھی ہیں۔ ان کے خیال میں :

(1) اسلام رحمۃ اللعالمین ہیں اور عورتوں کے لیے بھی رحمت ہے۔

(2) مذہبی نصوص کو تعبیر کے تین اصول ہیں :

(i) بیانی: کسی بھی متن کی تعبیر کے لیے صرف اور صرف اس پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے اسباب نزول دیکھنے ہیں۔ اسباب الورود دیکھے جاتے ہیں اور ہمہ گیر اور جامع مطالعہ کرنا چاہیے۔

(ii) برہانی: ہمیں معلومات، تجربات کے تنوع کو دیکھنا ہے اور علم اور سائنس کی تحقیقات کو مد نظر رکھنا ہے۔

(iii) تعبیر کے عمل میں روحانی حکمت پر غور کرنا چاہیے اور ایسے تعبیر کرنی چاہیے جو انسانیت کے لیے مفید ہو۔

عہد حاضر کی دینی تعبیرات مرد و حضرات نے اپنے اپنے حوالے سے کی ہیں اور اس میں ان کی تعلیم، تربیت اور مقامی کلچر کا اثر ہے جبکہ اسلام صنفی عدل چاہتا ہے اور عالمی عمدہ اقدار کو تسلیم کرتا ہے۔

درج بالا نقاط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک قومی مذہبی تنظیم محمدیہ سے تعلق والی خاتون کا کتنا تعلیمی ریکارڈ شاندار ہے۔ ان نے قدیم اور جدید تعلیم حاصل کر رکھی ہے۔ ذاتی زندگی میں شرع کی پابند ہے۔ حکومت کے ایک اہم عہدے پر فائز ہے۔ پاکستان میں اس طرح کمیشن پر عمومی مذہبی خواتین نہیں لگائی جاتیں چونکہ ان کی ان معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ تعبیر متن / نص کے یہ اصول انتہائی شاندار ہیں اور ان کو استعمال کر کے دین کو عصر حاضر سے جوڑا جا سکتا ہے۔ اس لیے انڈونیشی خواتین وہاں کے معاشرے میں بھرپور اور متحرک کردار ادا کر رہی ہیں۔

محمدیہ انڈونیشیا کہ سب سے پرانی مذہبی و سماجی تنظیم ہے، جس مقصد قرآن و سنہ کی روشنی میں اجتہاد کرنا تھا اور علما کی روایتی تعبیرات کی تقلید نہیں کرنی تھی۔ اس نے تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ تعلیم میں دینی اور دنیا کی تعلیم میں فرق نہ کیا۔ یہ اگرچہ مقامی ثقافت کی حمایت کرتی ہے مگر اس کا اس مقصد اسلام کو مقامی غلط رسوم و رواج سے پاک کرنا تھا۔

اس کی بنیاد حامی محمد درویش احمد دھلان نے 1912ء میں رکھی۔ جناب احمد دھلان حضور نبی کریم ﷺ کے خاندان سے تھے اور آپ کے والد محترم امام تھے۔ آپ حج کے لیے سعودیہ تشریف لے گئے اور وہاں کچھ سال قیام کیا اور مذہبی تعلیم حاصل کی اور مصر کے مذہبی اصلاحی رہنما جناب مفتی محمد عبدہ اور رشید رضا کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے اور واپس آکر اس تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ آپ کا انتقال 1923ء میں ہوا اور انڈونیشیا میں آپ کو سرکاری طور پر ایک قومی ہیرو سمجھا جاتا ہے۔

فکری لحاظ سے محمدیہ سنی اسلام پر یقین رکھتی ہے اور فقہی مذاہب کی بجائے قرآن و سنۃ کو اسلام کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے اس کو بعض سکالر سلفی تحریک بھی کہتے ہیں۔ محمدیہ کی تعلیمات میں امام ابن تیمیہؒ (متوفی 1328ء)، امام ابن قیمؒ (متوفی 1350ء)، محمد بن عبدالوہاب (متوفی 1792ء)، مفتی محمد عبدہ (1905ء) اور محمد رشید رضا (متوفی 1835ء) کے حوالہ جات ملتے ہیں۔ محمدیہ تصوف کے حق میں ہے اور اسلامی فکر کو جدید فکر سے ہم آہنگ کرنے پر یقین رکھتی ہے۔

محمدیہ کا ڈھانچہ مکمل طور پر جمہوری اور شوریٰ ہے اور اس کے چیئرمین، سیکریٹری وغیرہ کا قومی سطح پر انتخاب ہوتا ہے۔ اس کے بہت سے ہسپتال بھی ہیں۔ اس کے کم و بیش 3 کروڑ ممبر ہیں۔

ان کی تعلیمی شعبے میں خدمات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف محمدیہ کے زیر اہتمام 36 یونیورسٹیاں ہیں، اور اس کے ساتھ سات ہزار سکول بھی چلاتی ہے۔ بعض خواتین کی یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن کے چوکیدار سے لے کر وائس چانسلر تک سب عہدوں پر خواتین ہوتی ہیں۔ انڈونیشیا میں مسلمان خواتین میں دینی تعلیم کا ایک بڑا وسیع نظام کام کر رہا ہے۔ محمدیہ کی سات ذیلی تنظیمیں ہیں جو خواتین، نوجوان مردوں، نوجوان خواتین، کالج کے طلاب علموں، مارشل آرٹ اور سکاؤٹنگ کے لیے ہیں۔

نہضۃ العلماء انڈونیشیا کی سب سے بڑی مذہبی جماعت ہے جس کی بنیاد 1926ء میں رکھی گئی۔ ان کی فقہی مذہب شافعی ہے جبکہ دینی تعبیر روایتی ہے۔ یہ مقامی ثقافت کو قبول کرتے ہیں جب تک کہ یہ دین کی بنیادی تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔ ان پہ امام غزالیؒ کی دینی اور حضرت جنید بغدادیؒ کی صوفیانہ تعلیمات کا غلبہ ہے۔ یہ اپنی سوچ کو انڈونیشین اسلام کہتے ہیں، جس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی تعبیر میں انڈونیشیا کے مقامی سماجی حالات، ثقافی اقدار اور رسوم و رواج کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس تعبیر میں برداشت اور اعتدال کا غلبہ موجود ہے اور بنیاد پرستی کے خلاف ہے اور تکثیریت پائی جاتی ہے۔ یہ عام طور پر اشاعرہ اور ماتریدیہ کے علم الکلام کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ترقی طرف مائل آزاد خیال اور تکثیری اسلامی تحریک ہے۔ اس تنظیم کو مولانا ہاشم اسیری نے بنایا تھا اور اس تحریک نے انڈونیشیا کی آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا تھا۔

محمدیہ اور نہضۃ العلماء سے وابستہ ہزاروں مبلغات نے مجلس تعلیم یا درس قرآن کے حلقے قائم کر رکھے ہیں۔ بہت سی مبلغات مذکورہ تنظیموں سے الگ رہ کر بھی خواتین کی دینی تعلیم و تربیت کی یہ خدمت انجام دے رہی ہیں۔ وہاں خواتین دینی حلقے میں ایک توانا رائے بھی رکھتی ہیں۔ بلکہ ان کی بعض تنظیمیں اور علمی حلقے باقاعدہ فتاوی بھی جاری کرتے ہیں۔ مثال کے طور پہ لڑکیوں کی جبری شادی کے خلاف خواتین کی ایک علمی جماعت کا فتوی ہے جسے حکومت نے بھی قبول کیا ہے۔ اسی طرح خواتین سے متعلقہ کئی امور میں ان کے فتاوی صادر ہوئے ہیں اور انہیں اعتماد حاصل ہے۔

پاکستان کے دینی اداروں کے برعکس یہ مدارس تنظیمی اعتبار سے زیادہ مستحکم اور مالی لحاظ سے بھی کافی حد تک خود کفیل ہیں۔ وہاں کا دینی طبقہ مصری اور ازہری روایت کے ساتھ وابستگی رکھتا ہے۔ نقطہ نظر میں بنیادی اختلاف کے باوجود نہضۃ اور محمدیہ دونوں مکاتب فکر کے انڈونیشی مدارس کے علماء اور اساتذہ کا تعلق الازہر یونیورسٹی سے اچھی طرح قائم ہے۔

محمدیہ تنظیم اگرچہ ایک سلفی جماعت ہے، اس کے باوجود اس میں سلفیت کے وہ سخت گیر عناصر نہیں پائے جاتے جو بعض عرب ملکوں یا پاکستان میں نظر آتے ہیں۔ اس جماعت کے رہنماؤں پر اصل میں ڈاکٹر فضل الرحمان کی فکر کے بھی اثرات ہیں جو ایک پاکستانی عالم تھے، مگر یہاں سے نکال دیے گئے اور شکاگو کی ایک یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ان کی وفات بھی وہیں ہوئی۔[ii]

[ii] ڈاکٹر فضل الرحمان اسلام کے معروف اسکالر تھے۔ انہوں نے عربی کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی میں حاصل کی، بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔ پہلے ڈرہم یونیورسٹی (Durham University) اور پھر میک گل یونیورسٹی (McGill University) میں چلے گئے جہاں وہ 1961 تک اسلامی علوم پڑھاتے رہے۔ پھر وہ پاکستان آگئے تاکہ اسلامی ریسرچ کے مرکزی انسٹیٹیوٹ کی سربراہی کر سکیں۔ ستمبر 1968 میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر یونیورسٹی آف شکاگو امریکا چلے گئے جہاں انہوں نے مشرق قریب پر تحقیقی پروگرام شروع کیا جو اب بھی دنیا کے بہترین پروگراموں میں شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمان اسلامی حکومت و معاشرے کی اصلاح کے علمبردار بھی بنے۔ 1988 میں امریکا میں وفات پائی۔ وفات کے بعد ان کی تحریریں دنیا بھر اور بالخصوص مشرق قریب کے علماء اور اہل دانش میں مزید مقبول ہو رہی ہیں۔ یونیورسٹی آف شکاگو میں ان کی خدمات کا ابھی تک اعتراف کیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی میں مرکز برائے مطالعہ مشرق وسطی کو ان سے منسوب کیا گیا ہے۔

نہضۃ العلماء کے اوپر امام غزالی کی اخلاقی تعلیمات کا بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کی رائے ہے کہ دین کی تعبیر اخلاقیات کے ساتھ ہوگی۔ انسان اور انسانی سماج کو معتدل، روادار اور اچھے اخلاق کا مالک بنانا اہم مقصد ہے۔ وہ حدود اور دیگر ایسے احکامات کو بھی مانتے ہیں، لیکن تنقیدی حیثیت میں وہ حسن اخلاق اور نرم ذرائع کے استعمال کو زیادہ مؤثر سمجھتے ہیں۔

ان جماعتوں نے خالص دینی مدارس بھی بڑی تعداد میں قائم کر رکھے ہیں جو جدید طرز تعلیم کے ساتھ آراستہ ہیں۔ تعلیم اگرچہ مذہبی ہوگی، مگر طریق تدریس اور ماحول وغیرہ عصری اداروں والا ہوتا ہے۔ ان مدارس سے نکلنے والے طلبہ، اسلامی اور عصری تعلیم کے دونوں دھاروں کا فہم رکھتے ہیں، اور بعد ازاں اعلی تعلیم میں اپنے رجحان طبع کے تحت دینی یا دینوی علوم میں سے جس جانب جانا چاہیں سہولت سے جا سکتے ہیں۔ عام سرکاری سکولوں کی بہ نسبت یہاں کے طالب عربی، قرآن اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ سماجی علوم کے وسیع فہم سے بھی روشناس ہوتے ہیں۔ اس لیے مدرسہ سسٹم کے لیے معاشرے میں خاصا احترام پایا جاتا ہے۔

نہضۃ علما اور محمدیہ اپنی تحریروں میں بار بار انڈونیشین آئین کے ان پانچ اصولوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی روح پورے آئین میں ہے اور ان کو مقامی طور پہ پانچ اصول (Pancasila) کہتے ہیں جو یہ ہیں:

1. خدا کی وحدانیت
2. ایک عادلانہ اور مہذب انسانی معاشرہ
3. انڈونیشیا کی قومی وحدت
4. انڈونیشین عوام کی مشاورت سے بنی ہوئی جمہوری طرز زندگی
5. سماجی انصاف

یہ بات ہمارے لیے حیران کن تھی کہ بڑی دینی جماعتیں آئین کے ان بنیادی اصولوں کا بار بار حوالہ دیتی ہیں اور یہ اصول نہ صرف مقامی سوچ رکھتے ہیں بلکہ انسانیت کو بھی اپنے دائرے میں لاتے ہیں۔

انڈونیشیا کے علما کے ہاں مذہبی تعبیر کے نمایاں اصول کون سے ہیں۔ یہ جاننے سے قبل دین کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

3- دینی تعبیر کے مروجہ اُصول

دین، بنیادی طور پہ قرآن اور سنت کا نام ہے۔ دین کی اساس انہی دو چیزوں پر قائم ہے۔ قرآنِ حکیم کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی ماخذ سنت ہے۔ اس کے علاوہ فقہ کی کتب میں عموماً قیاس اور اجماع کو بھی شامل کیا گیا ہوتا ہے، لیکن وہ دین کے اصل مصادر نہیں ہیں، یہ اجتہاد کے ذرائع کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن وسنت سے استدلال واستنباط کے لیے بعض دیگر ذرائع بھی استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً: استحسان، استصلاح، تعامل، عرف وعادت، وغیرہ۔ یہ سب اجتہادی ذرائع ہیں، ان کی حیثیت دین کے مآخذ کی نہیں ہے۔ یہ ذیلی مصادر اور ان کی اصطلاحات دراصل فقہاء کرام کی ایجاد کردہ ہیں جو انہوں نے بعد میں رفتہ رفتہ اپنے اپنے ذوق اور فہم کے مطابق متعارف کروادیں۔ کلاسیکی ادوار میں مسائل کو قرآن وسنت پر ہی پرکھا جاتا تھا۔

قرآن کریم میں جو آیات وارد ہوئی ہیں ان کی تفسیر میں پہلے دیکھا جائے گا کہ استعمال ہونے والے لفظ کی کیا لغوی شرح کی جاسکتی ہے تو تفسیر لغوی معنی کے لحاظ سے کردی جائے گی۔ مثال کے طور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا معنی لغت وعرف میں متعین ہے اور ان کی کوئی دوسری شرح کا امکان نہیں تو ایسے الفاظ کو لغوی معانی پر ہی محمول کرلیا جائے گا۔ جیسا کہ ماء (پانی)، شجر (درخت) جیسے الفاظ یا پھر ایسی تمام آیات کہ جو مخصوص تشریعی احکامات کے علاوہ نصیحت و تربیت کے لیے وارد ہوئی ہیں۔ جیسا کہ 'اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَافَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا[iii]'(اور اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف بھی نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے ادب سے بات کرو) اب اس آیت میں ایسی کوئی

[iii] سورۃ الاسراء: 23

بات یالفظ نہیں ہے جو عام فہم یالغوی و عرفی معنی سے ہٹ کر ہو۔اس طرح کی تمام آیات اپنے لغوی اور عرف کے معنی پر محمول کی جائیں گی۔اس کے علاوہ، بعض وہ الفاظ ہیں جو شریعت کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاصلوۃ، زکاۃ، حج، صوم، طواف وغیرہ۔ان الفاظ کے معانی کا تعین کرنااور ان الفاظ کی وضاحت کرنا صرف شریعت کے دائرہ اختیار میں ہے نہ کہ لغت یا عرف کے۔اس قسم کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان کر دیا ہے۔لہٰذا کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ان متعین اصطلاحات کی تعریف لغت کی کتب سے تلاش کرے یااس میں کچھ اضافہ کرنے کی کوشش کرے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کے اسلوب پر متعدد تفاسیر لکھی گئی ہیں، جن مفسرین کرام نے اس طرز کو اختیار کیا ہے ان میں زرکشی، سیوطی، زرقانی، صابونی اور شاہ ولی وغیرہ جیسے علماء کے نام نمایاں ہیں۔ تفسیر القرآن بالقرآن کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جو چیز ایک جگہ مختصر آئی ہے اسکی تفسیر آیات کے ساتھ کی جائے جہاں وہی مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً آدمؑ اور ابلیس کا واقعہ بعض جگہ مختصر آیا ہے اور دوسری جگہ مفصل اور یہی حال موسیٰؑ اور فرعون کے واقعے کا ہے۔اسی طرح تفسیر القرآن بالقرآن کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ مجمل کو مفصل پر محمول کر کے اس کے ساتھ تفسیر کی جائے۔

تفسیر کے اندر ایک اہم پہلو حدیث مبارکہ کا ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں جن کی توضیح احادیث مبارکہ سے ہوتی ہے۔مثال کے طور پہ ایک آیت ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ[iv]

(جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے بچاتے رہے ان کو امن ہو گا اور وہ لوگ ہی ہدایت یافتہ ہیں)

اس آیت میں لفظ ظلم بہ ظاہر زیادتی کے معنی پر محمول ہے اور اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔صحابہ کرامؓ نے بھی اس کے ظاہری مفہوم پر محمول کرتے ہوئے اس سے ہر چھوٹا بڑا ظلم

[iv] سورۃ الانعام:82

مراد سمجھ لیا تھا۔ مگر ان کا یہ فہم صحیح نہیں تھا۔ انہیں اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا کہ "یارسول اللہؐ! ہم میں سے ایسا کون ہے جس کے ایمان میں ظلم کا شائبہ نہیں ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہاں ظلم کا عام مفہوم مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے شرک مراد ہے۔ کیا تم کو حضرت لقمان کا قول معلوم نہیں کہ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْم[v] یعنی "شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔[vi]

تعبیرِ دین کے اصول کے طور پر قرآن وحدیث کے بعد اقوالِ صحابہؓ وتابعین کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ صحابہ کرامؓ کے اقوال کو دیکھا جائے گا، اگر انہوں نے کوئی شرح کی ہے تو راجح ہوگی:

إذا تكلم صحابي في آية ولم يعلم أحد من الصحابة رضي الله عنهم خالفه لم يسع مخالفته لأنهم أعلم بالتنزيل والتأويل۔[vii]

(جب ایک صحابی کسی آیت کی تفسیر بیان کرے اور اس کی مخالفت دوسرے صحابہ میں سے کسی سے معلوم نہ ہو تو ایسی تفسیر کی مخالفت کی بالکل گنجائش نہیں ہوتی کیوں کہ صحابہ کرامؓ تنزیل و تفسیرِ قرآن کو زیادہ جاننے والے تھے)

صحابہ کی ایک بڑی جماعت علم تفسیر کی خدمت کے لیے مصروف رہی ان میں حضرت عبد اللہ ابن عباس کو امتیازی شان حاصل ہے، اسی بناپر انہیں ترجمان القرآن اور امام المتقدمین کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے کئی واسطوں سے ان کی بہت سی روایات لی ہیں۔

صحابہ کرام نے مختلف مقامات پر قرآن کریم کے درس کا سلسلہ جاری رکھا، ان کی تعلیم و تربیت سے

---

[v] سورۃ لقمان:13

[vi] صحیح بخاری، رقم الحدیث:4629

[vii] امام ابو جعفر النحاس، الناسخ والمنسوخ، 687

تابعین کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی۔ تابعین کی کثیر تعداد نے مشہور مفسرین صحابہ سے کسب فیض کیا۔ ان میں سعید ابن جبیر سر فہرست ہیں جنہیں حدیث و تفسیر و فقہ میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ یہ مشہور صحابہ کے شاگرد ہیں۔ خصوصی طور پر حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کے دامن سے وابستہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے طائف میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھااور وہیں دفن ہوئے۔

اس منہج کو تفسیر بالماثور کہا جاتاہے، جسے امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اپنایاہے کہ انہوں نے اسلاف امت کے اقوال جمع کر دیے ہیں۔ بعد میں اہل علم نے ان ذرائع کے علاوہ، تفسیر بالرائی بھی اختیار کرلی۔ یہ وہ تفسیر ہے جو اجتہاد کے ذریعے کی جاتی ہے، لیکن اسکے لیے شرط یہ ہے کہ مفسر کلام عرب، عربی الفاظ اور انکی اوجہ دلالیہ سے، اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ جیسے امور کی معرفت رکھتا ہو۔ میری رائے میں تفسیر ماثور بھی اصل میں تفسیر بالرائے ہی ہے، کیونکہ اس میں بھی پرانے علماء کی آراء ہیں۔ یہ نکتہ غور طلب ہے۔

یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن کے ذریعے ہمارے روایتی علما قرآن و حدیث کے متن کی تعبیر کرتے ہیں مگر انڈونیشیا میں تعبیر کے اصول ان کے علاوہ بھی ہیں جو زیادہ تر مقاصد شریعت کے حوالے سے ہیں۔

4- مقاصد شریعت کی اہمیت

بعد کے ادوار میں بعض علماء امت کو یہ محسوس ہوا کہ ہمیں قرآن و حدیث کے بنیادی مآخذ میں جو احکامات عطا کیے گئے ہیں، ان کے جوہر اور مقاصد کی کھوج لگائی جائے کہ جن کی رعایت یا بقا شریعت میں دراصل مقصود ہے۔ اسے جدید قانون کی زبان میں مقاصدِ شریعت(objectives of shariah) کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے امام الحرمین جوینی (وفات:1085ء) نے یہ اصطلاح استعمال کی۔ امام جوینی کے شاگرد امام غزالی نے احیاءالعلوم میں اس پر اشارات دیے ہیں۔ ہر چند کہ ماضی میں کئی مسلم مفکرین نے اصولی، عقائدی، سیاسی اور اجتہادی مقاصد پر کلام کیا تھا لیکن اس کی

زیادہ پذیرائی امام شاطبیؒ کی الموافقات کے شائع ہونے کے بعد ہوئی، امام شاطبیؒ کے بعد طاہر بن عاشور نے اس کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ معاصر علماء میں سے ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے اپنی کتاب ''شریعۃ الاسلام'' کی ایک فصل ''الشریعۃ الخالدۃ واوضاعھا المتجددۃ'' میں اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے اور اس میں مقاصد پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی کتاب 'مقاصدِ شریعت' ایک اہم کوشش ہے۔

قدیم مقاصدی فقہاء کے مطابق، پوری شریعت درج ذیل پانچ چیزوں کے تحفظ کی غرض سے قائم کی گئی ہے: تحفظ دین، تحفظ جان/نفس، تحفظ عقل، تحفظ نسل، تحفظ مال۔ قرآن وحدیث کے تمام احکامات کا اصل اور انتہائی ہدف یہی امور ہیں۔ بعد میں فقہاء نے وقت کے ساتھ ان میں اضافے بھی کیے۔

مقاصد شریعت کی بطور ایک مستقل فن تعریف و تشریح اگرچہ بعد میں ہوئی ہے لیکن عملاً اس کا وجود اتنا قدیم ہے جتنا کہ خود اسلام۔ قرآن کریم میں اکثر فرامین الہیہ کے ساتھ مقصد وغایت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ طرز کلام دلالت کرتا ہے کہ شریعت میں مقاصد کا کیا مقام ہے۔ رسول کیوں مبعوث کئے، آسمان سے کتابیں کس لیے نازل کی گئیں، کائنات اور زندگی کا ظہور کیا اسباب و مصالح رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی عقائد واحکامات کی وجوہات بیان کی گئیں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ قرآن کے اس منہج کا ہدف صرف یہ ہے کہ انسانی عقل کو مطمئن کیا جاسکے۔ اگرچہ ایک اصول کے تحت تو یہ منہج بعد کے فقہاء کے ہاں مرتب ہوا، مگر جزوی طور پہ مسائل کی حد تک مقاصد کی رعایت صحابہ کرام اور تابعین کے اجتہاد میں بھی ملتی ہے۔ امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

الصحابه الذين عرفوا مقاصد الشريعه فحصلوها واسّسوا قواعدها واصولها ،وجالت افكارهم فى آيا تها واعملوا الجهد فى تحقيق مبادئها وغايا تها،فصاروا خاصة الخاصة ولّب اللباب ونجوماً يهتدى بانوارهم اولوالالباب[viii]

[viii] الموافقات، 2/1

(صحابہ کرام وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے مقاصد شریعت کا ادراک کیااور ان کے اصول وضوابط تک رسائی حاصل کی۔ان کی فکرنے مقاصد کے اوصاف کو پہچانا اور انکے مبادی وغایات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کی،اسی وجہ سے وہ منتخب ومختار طبقہ ٹھہرے، ایسے نجوم کہلائے جن سے عقل والے ہدایت کانور حاصل کرتے ہیں)

حضرت ابراہیم نخعی کا قول ہے:

ان احکام اللہ تعالی لھا غایات ھی حکم ومصالح راجعۃ الینا[ix]

(احکام الہیہ کے مقاصدوغایات ہیں جنہیں حکمتیں اور مصالح کہاجاتاہے اور ان سے انسانوں کامفاد مطلوب ہوتاہے)

5- انڈونیشیامیں تعبیرِ دین کے اصول

یہ تو تفہیمِ دین کے وہ عمومی مصادر واصول ہیں جو اصول فقہ کی علمی مباحث کے زمرے میں آتے ہیں،اور تعبیرِ دین کے ذرائع ہیں۔انڈونیشیامیں بھی تعبیر دین میں انہی اصولوں کی رعایت کی جاتی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ وہ تفہیمِ دین کے ایسے اصولوں پر بھی یقین رکھتے ہیں جو شریعت کے مقاصدی وانسانی مصلحتی پہلو کا حصہ ہیں۔نڈونیشی علما اجتہاد کو لازمی سمجھتے ہیں اور اسی لیے مقاصدِ شریعہ کو بہ طور ذریعہ استعمال کرتے ہیں۔

(1) رحمت

دین کاایک اہم اصول رحمت ہے۔قرآن کریم میں فرمایا گیاہے:

وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔[x]

[ix] ابن رشد وعلوم الشریعہ، حمادی العبیدی،102

[x] سورۃ الانبیاء:107

(ہم نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

اگرچہ یہاں حوالے کے لیے نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا گیا ہے، مگر رحمت کا یہ مصداق عمومی حیثیت میں سارا دین ہے۔ یعنی کہ یہ دین اسلام تمام جہان کے لیے رحمت ہے۔ رحمت سے مراد افادہِ عام ہے۔ افادے اور رحمت کی شکلیں ہر مخلوق اور ہر شعبے کے لیے موجود ہیں۔ ہم نے ماحول کو صاف رکھنا ہے، یہ بھی رحمت کی صورت ہے۔ جانوروں کو تکلیف نہیں دینی۔ غیر مسلموں سے بھی بہ طور انسان اچھا برتاؤ کرنا ہے۔ مجادلہ اور لڑائی نہیں کرنی۔ لہذا وہ اس کو ایک وسیع مفہوم میں لیتے ہیں اور ر اس پر تکثیریت پسندی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسی لیے انڈونیشیا میں عام طور پر یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے کہ 'اسلام رحمت للعالمین' ہے۔ پہلے تو یہ اصطلاح مجھے بہت عجیب لگی، مگر جوں جوں غور کرتا چلا گیا دل نورِ ایمان سے بھرتا چلا گیا۔

(2) آفاقیت

ان کے نزدیک تعبیر دین کا ایک اور اہم اصول آفاقیت اور انسان دوستی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خالصتاً انسانی بنیادوں پر تشکیل معاشرہ کا عمل اختیار فرمایا۔ آپ ﷺ کی جدوجہد کے نتیجے میں جو پہلا سماج مدینہ منورہ میں قائم ہوا، اس کا بنیادی مقصد ہی بلا تفریق، رنگ، نسل اور مذہب تکریم انسانیت اور انہیں انسانی حقوق کی فراہمی تھا۔ یہی وجہ ہے اس ریاستی نظام کی تشکیل اور اس کے سیاسی و معاشی ثمرات کے حصول میں مہاجرین وانصار کے ساتھ ساتھ مدینہ کے غیر مسلم قبائل بھی یکساں طور پر شریک رہے۔ دعوت کی بنیاد اسلامی عالمگیریت پر ہے جو تمام بنی نوع انسان کی ابتدا، فطرت اور مقصد کے اشتراک کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ ادراک قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے:

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔[xi]

[xi] سورۃ الاسراء: 70

(اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو ستھری چیزوں سے رزق دیا اور انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر بہت سی برتری دی)

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔[xii]

(اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ)

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ[xiii]۔

(اور ہم نے آپ کو جو بھیجا ہے تو صرف سب لوگوں کو خوشی اور ڈر سنانے کے لیے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)

انڈونیشی علما کے نزدیک قرآن پاک کی یہ آیات ہمیں سبق دیتی ہیں کہ اسلام ایک آفاقی دین ہے۔اس لیے اس کی تعبیر بھی آفاقی ہو گی اور سب ممالک، طبقات، مذاہب کے لیے یکساں ہو گی۔

(3) وسطیت

انڈونیشیا کے اہل علم طبقے میں تعبیر دین کا ایک اور اصول اعتدال اور وسطیت ہے۔افراط و تفریط سے احتراز کیا جائے گا۔یہی عدل ہے۔عدل قائم رکھنے یا افراط و تفریط سے بچنے کا اطلاق اس پر بھی ہو گا کہ تعبیر دین میں صنفی یا گروہی تعصب کو نہیں آنے دیا جائے گا۔قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ۔[xiv]

(اسی طرح ہم نے تمہیں اعتدال والی امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاو)

[xii] سورۃ البقرۃ:21

[xiii] سورۃ سبا:28

[xiv] سورۃ البقرہ:143

اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خير الأمور أوسطها۔

(بہترین کام وہ ہیں جن میں میانہ روی اختیار کی جائے)

قرآن تمام مسلمانوں کو افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ بات سمجھاتا ہے کہ اللہ کی رحمت کے حصول کی راہ اعتدال ہے۔ عدل یا اعتدال کا صریح تقاضا یہ بھی ہے کہ دین اور دینی تعبیرات کو عام اور مساوی رکھا جائے۔

(4) عرف کی رعایت

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ احکامات میں زمان و مکان اور عرف کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔ یعنی کہ دین کی حرفی تعبیر نہیں کی جائے گی، بلکہ جہاں ممکن ہو، وہاں زمان و مکان اور عرف کی بھی رعایت رکھی جائے گی۔ وہ علماء جن کا کام دینی مسائل میں راہنمائی کرنا ہوتا ہے ان پر فرض ہے کہ وہ زمانی حاجت اور مصلحتِ عامہ کا اصول اپنے ذہن میں رکھیں اور اسی کے آئینے میں احکامات کا استخراج کریں۔ امام شافعی جب بغداد میں تھے تو ان کی فقہ الگ تھی، اور جب آپ قاہرہ گئے تو بہت امور میں تبدیلی آگئی۔ امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ مفتی فتویٰ دیتے وقت حالات کے انجام اور نتائج کو بھی مدّ نظر رکھے اگر کوئی حکم نقصان کا باعث بنے تو اسے صادر کرنے سے گریز کرے۔ احمد الریسونی انکی رائے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ان المجتهد حين يجتهد ويحكم ويفتى عليه ان يقدّر مآلات الافعال ويقدر عواقب حكمه وفتواه،وان لا يعتبر انّ مهمّته تنحصر فى اعطاءالحكم الشرعى بل مهمّته ان يحكم فى الفعل وهو يستحضر مآله او مآلاته وان يصدر الحكم وهو ناظر الى اثره او آثاره،فاذا لم يفعل فهو اما قاصر عن درجة الاجتهاد او مقصر فيها[xv]

[xv] نظریۃ المقاصد عند الشاطبیؒ، احمد الریسونی، 302

"مجتہد جب اجتہاد کے بعد کوئی حکم یا فتوی صادر کرتا ہے تو اس وقت اس پر لازم ہے کہ وہ فتوی کے نتائج اور عواقب کو بھی ذہن میں رکھے، وہ یہ نہ خیال کرے کہ اس کا کام صرف شرعی حکم صادر کرنا ہے، اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ یہ سامنے رکھے کہ اس فتوے کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ مجتہد اگر ایسا نہیں کرتا تو وہ اجتہاد کی شرائط پر پورا نہیں اترتا یا پھر وہ جان بوجھ کر کوتاہی کر رہا ہے"۔

(5) صنفی مساوات

دین کے جتنے اور جو بھی احکامات ہیں ان میں مرد اور عورت کو مساوی حیثیت حاصل ہے، اور وہ ان احکامات کے برابر مخاطب ہیں۔ مثال کے طور پہ قرآن کریم میں مردوں کو قوام کہا گیا ہے۔ ان کے مطابق قوام کا تناظر ثقافتی اور وقتی ہے۔ یہ محض مرد کی حتمی حیثیت نہیں ہے۔ ان کے علماء یہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن کریم کی کسی عمومی آیت کی کوئی ایسی تعبیر نہیں کریں گے جو صرف مرد کے لیے یا صرف خاتون کے لیے مخصوص ہو۔ اس لیے کہ خدا انسان کے لیے ہے۔ بلکہ وہ یہ جملہ استعمال کرتے ہیں کہ خدا کی کوئی ذات تو نہیں ہے، کہ وہ مرد ہو۔ اس لیے تعبیر دین مساوی ہو گی۔ وہ 'قوام' کے ذیل میں یہ بتاتے ہیں کہ اس کے اطلاقی معنی میں دونوں اصناف شامل ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے مفاد کا خیال رکھیں گے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے شر سے بچایا جائے گا۔ کوئی بھی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جو کسی ایک صنف کے لیے تعصب یا جانبداری پر مبنی ہو۔

اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ ان کی اس تقریر کے بعد ہمارے وفد کے ایک عالم دین نے سوال کیا کہ قرآن مجید میں تو لکھا ہے کہ

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَي النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ[xvi]

(مرد خواتین پر حاکم ہیں اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے)

[xvi] النساء، 34:

جبکہ آپ کی تعبیرات میں برابری نظر آرہی ہے۔ کیا یہ اسلام کی رو سے صحیح ہے۔ ڈاکٹر عالمہ نے بہت اچھی طرح سے اس کی وضاحت کی کہ یہاں مرد قوام اس لیے ہے کہ وہ خواتین کی مالی کفالت کرتا ہے اور اگر ایک عورت مرد کی کفالت کرتی ہے تو قران مجید کے بقول وہ قوام بن جائے گی اور عہد حاضر میں حقوق انسانی نے عورت کو ایک مکمل انسان تسلیم کر لیا ہے اور یہ عرف ہے جو اسلام کے مطابق ہے۔ اس لیے ہمیں عورت اور مرد میں برابری کرنا ہے۔ نصوص کی تعبیر کے یہ اصول نہ صرف نئے ہیں بلکہ بہت اہم ہیں۔ یعنی کہ قرآن پاک اور جدت کی ایسی تعبیر کی جائے گی جس میں مرد اور عورت کی برابری اور باہمی مفاد ہو گا اور وہ عہد حاضر کے عرف کے مطابق ہو۔ ہمارے علما اور فقہا کو اس طرز تعبیر پر بہت سنجیدہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(6) بین الاقوامی معاہدات کی رعایت

دنیا میں بہت سے ایسے عالمی قوانین یا معاہدات ہوتے ہیں جو تمام انسانوں کی بلاامتیاز بہبود کے لیے ناگزیر سمجھے جاتے ہیں اور اس میں ممالک یا معاشروں کی تقسیم یا فرق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور اقوام متحدہ کا تشدد کی روک تھام کے لیے ایک معاہدہ ہے Convention Against Torture، یہ دنیا میں غیر انسانی سزاؤں اور تشدد کو روکنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس طرح کے کئی بین الاقوامی معاہدات ہیں۔ انڈونیشی علماء اس طرح کے معاہدات کو شرعی بنیاد فراہم کرتے ہوئے ان کی حمایت کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک یا اداروں کے ایسے قوانین جو انسانی نوعیت کے ہوں، یا شرعی طور پہ وہ غلط نہ ہوں، بلکہ وہ ناگزیر ہو جائیں تو انہیں اپنا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے زراعت و مالیاتی قانون میں شامی، مصری اور ایرانی قانون کی پیروی کی، رجسٹر اور حسابات رکھنے کے طریقے ان سے اخذ کیے، غیر اسلامی حکومتوں کے تاجروں پر اتنا محصول عائد کیا جتنا کہ ان کی حکومتیں مسلمان تاجروں پر عائد کیا کرتی تھیں۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کی مقرر کردہ حدود کے اندر دوسرے ممالک کے قانون سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی میں بین الاقوامی معاہدات بھی آجاتے ہیں۔

(7) شریعت کی حدود

تاریخ اور سیر کی کتب میں وارد ہونے والی ہر روایت اور فقہ کی کتب میں مذکور ہر مسئلہ شریعت نہیں ہے۔اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ سے صادر ہونے والے ہر قول و فعل کو قطعی شرعی حکم سمجھنا بھی غلطی ہے، بعض امور کا تعلق وقتی سیاسی اجتہاد سے تھا، بعض چیزیں اخلاقی تربیت کے لیے تھیں، جبکہ بعض دیگر کی حیثیت شرعی حکم کی تھی۔ لہذا ان درجات کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔آپ ﷺ کی شخصیت کا جس طرح سے ایک نبوی تبلیغی پہلو ہے کہ جس میں آپ ﷺ وحی الٰہی کے پابند ہوتے ہیں، اس میں نہ آپ ﷺ تبدیلی کر سکتے ہیں اور نہ امّتِ مسلمہ کا کوئی فرد اجتہاد کرنے کا حق رکھتا ہے۔ایسے احکامات ابدی اور ناقابل تغیر ہیں، کسی بھی عہد میں کسی بھی مصلحت کی بنیاد پر ان مین ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے، جبکہ بعض افعال احکامات ایسے ہیں جنمیں اجتہاد کیا جا سکتا ہے اور حالات کے پیش نظر ان میں تبدیلی کی حاجت باقی رہتی ہے۔ کیونکہ بعض فرامین وحی الٰہی کا جز نہیں ہیں، ایسے ارشادات واعمال بطورِ انسان اور منتظم آپ ﷺ کی ذات سے صادر ہوئے ہیں۔ لہٰذا ضرورت کے وقت مسلمان ان میں اجتہاد کا حق رکھتے ہیں۔ مثلاً غزوہ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع کیا۔ بعد میں صحابہ کرامؓ کا اس مسئلے میں اختلاف ہو گیا کہ گدھوں کے گوشت کھانے کی نہی "نہیِ تشریعی" ہے یا اس کا تعلق مصلحت سے تھا۔ کیونکہ غزوہ خیبر میں مسلمانوں کی سواریاں کم پڑ گئی تھیں آپ ﷺ کو خدشہ تھا کہ اگر انہیں ذبح کر دیا گیا تو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے گا اس لیے بعض صحابہ اکرامؓ کا خیال تھا کہ یہ نہی نہیِ تشریعی نہیں تھی بلکہ اس کا منشاء ضرورت و مصلحت تھی۔ اگرچہ حدیث مبارکہ میں عموم ہے اور اس میں کوئی قید موجود نہیں ہے لیکن جس موقع پر یہ نہی وارد ہوئی اس وقت نہی کا متوقع سبب بھی موجود تھا۔اس لئے صحابہ کرامؓ کے ایک گروہ نے شارع کے حکم کو ضرورت و مصلحت پر محمول کرتے ہوئے گدھوں کے گوشت کو حلال سمجھا۔

(8) سنت کی اقسام

انڈونیشین علماء سنت کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر اس کی اقسام کرتے ہیں۔اس کی تفہیم سنت حضرت امام

شافعیؒ سے ہے اور ہمارے حضرت شاہ ولی نے بھی کچھ ایسی ہی تعبیر کی ہے۔ان دونوں علما کے نزدیک احادیث/سنت دو طرح کی ہیں:

(i) وہ احادیث/سنن جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور جن کا مقصد اللہ پاک کا پیغام پہنچانا ہے۔ان احادیث میں ایمانیات، عبادات اور اخلاقیات شامل ہیں۔ان میں بعض کا تعلق وحی سے ہے مگر بعض کا حضور نبی کریم ﷺ کے اجتہاد سے۔آپ ﷺ کا اجتہاد بھی ہم پر لازم ہے۔

(ii) وہ احادیث/سنن جو پیغام رسانی/نبوت سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ دنیاوی امور سے تعلق رکھتی ہیں۔اس کی سب سے بڑی مثال حضور نبی پاک ﷺ کے وہ ارشادات ہیں جو کھجور کو گابھا دینے سے متعلق ہیں:

(أ) جب حضور نبی کریم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ کھجوروں کو گابھا دیتے ہیں۔یعنی نر درخت کے پھول مادہ کے پھول میں رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کیا کرتے ہو؟ بتایا گیا کہ ہم ایسا کرتے آئے ہیں۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم یہ نہ کرو تو شاید بہتر ہو۔لوگوں نے عمل موقوف کر دیا مگر اس سال پھل کم رہا۔لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں ایک انسان ہی ہوں۔جب تمہیں کسی دینی معاملہ میں حکم دوں تو اسے لے لو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو میں ایک انسان ہی ہوں۔یعنی اس حکم کو لینا ضروری نہیں جیسے کسی بھی انسان کے حکم کو لینا ضروری نہیں[xvii]۔

(ب) حضور نبی کریم ﷺ ایسے لوگوں کے پاس سے گذرے جو کھجوروں کے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے۔آپ ﷺ نے دریافت کیا یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ بتایا گیا کہ کھجوروں کو گابھا

[xvii] صحیح مسلم

دے رہے ہیں۔ نر کے پھول کو مادہ کے پھول میں داخل کرتے ہیں تو وہ گابھن ہو جاتی ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے خیال میں تو یہ ایک بے فائدہ عمل ہے۔ سامعین نے یہ بات عاملین کو پہنچائی تو انہوں نے یہ کام کرنا چھوڑ دیا۔ مگر اس سال کھجوروں کے دانے چھوٹے رہے۔ اس کی آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اگر یہ عمل مفید ہو تو لوگ کریں۔ میں نے بس ایک گمان کیا تھا (یعنی رائے سے بات کہی تھی کوئی شرعی حکم نہیں دیا تھا) پس تم گمان کے سلسلہ میں میرا مؤاخذہ نہ کرو (کہ نبی کی بات غلط کیسے ہو گئی؟) البتہ جب میں اللہ پاک کی طرف سے تم سے کوئی بات کہوں (شرعی حکم دوں) تو اس کو لے لو کیونکہ میں اللہ پاک پر جھوٹ نہیں لگاتا[xviii]۔

(ت) اسی گابھا دینے کے معاملہ میں حضور نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنے دنیوی معاملات کو بہتر جانتے ہو[xix]۔

یہ تینوں روایتیں امام مسلمؒ نے کتاب الفضائل میں ذکر کی ہیں۔ اس قسم میں درج ذیل پانچ طرح کی روایات آتی ہیں:

(i) علاج معالجہ اور طب سے تعلق رکھنے والی روایات۔ یہ روایات کتب حدیث میں ابواب الطب کے عنوان سے ذکر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ روایت جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے اچھے برے گھوڑوں کی پہچان بتائی ہے وہ بھی اسی سلسلہ سے تعلق رکھتی ہیں[xx]۔ اس قسم کی روایات کا مدار تجربہ پر ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے پرکھ کہ بنیاد پر یہ باتیں بیان فرمائی ہیں۔ یہ ایسے احکام شرعیہ نہیں ہیں جن پر عمل واجب ہوتا ہے۔

[xviii] صحیح مسلم

[xix] صحیح مسلم

[xx] جامع ترمذی، ابواب الجہاد

(ii) امور عادیہ یعنی وہ روایات جن میں حضور نبی پاک ﷺ کے ایسے کاموں کا تذکرہ ہے جو آپ ﷺ نے عادت کے طور پر کیے ہیں، عبادات کے طور پر نہیں کئے، اتفاقاً کئے ہیں، بالقصد نہیں کئے۔ جیسے چمڑے کے دستر خوان پر کھانا، لکڑی کے پیالے میں پینا اور کھجور کے درخت کی چھال بھرے بستر پر سونا وغیرہ۔

(iii) مروجہ عام باتیں یعنی وہ روایات جن میں ایسی باتیں مذکور ہیں جس قسم کی باتیں سبھی لوگ کیا کرتے ہیں جیسے

(أ) حدیث ام زرع جس میں حضور نبی پاک ﷺ نے زمانہ جاہلیت کی گیارہ عورتوں کی اپنے شوہروں کے بارے میں گفتگو نقل کی ہے[xxi]۔

(ب) حدیث خرافہ: ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج کے سامنے کوئی دلچسپ بات بیان فرمائی تو ایک بیوی صاحبہ نے عرض کیا یہ بات تو خرافہ کی باتوں جیسی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جانتی ہو کہ خرافہ کون تھا؟ وہ قبیلہ بنو عذرہ کا ایک شخص تھا۔ زمانہ جاہلیت میں اس کو جنات گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ عرصہ دراز تک وہ ان کے یہاں رہا۔ پھر اس کو وہ انسانوں میں چھوڑ گئے تو وہ لوگوں سے وہاں کے عجائبات بیان کرتا تھا۔ اسی وقت سے یہ محاورہ چل پڑا ہے[xxii]۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ دلچسپ باتیں بھی لوگوں کو سناتے تھے مگر وہ برحق ہوتی تھیں۔ جھوٹ، فسانہ یا غلط بات کوئی نہیں ہوتی تھی البتہ وہ کوئی امر شرعی نہیں ہوتی تھیں۔

(ت) چند آدمی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ ہم سے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کیجیے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں آپ ﷺ کا پڑوسی تھا۔ جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ مجھے بلا بھیجتے۔

[xxi] صحیح بخاری، کتاب النکاح

[xxii] مسند امام احمد بن حنبل، شمائل ترمذی

میں آپ ﷺ کے لیے اس کو لکھ لیتا۔ آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ جب ہم دنیا کا تذکرہ کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے اور جب ہم آخرت کا تذکرہ کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے اور جب ہم کھانے کا تذکرہ کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے۔ پس رسول اللہ ﷺ کی یہ ساری باتیں میں تم سے بیان کروں؟ یعنی کوئی موضوع متعین کرو تو اس سلسلہ کا ارشاد سناؤں۔ عام سوال کا جواب کیسے دوں[xxiii]؟ اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ عام باتوں میں بھی لوگوں کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

(iv) ہنگامی ارشادات یعنی وہ روایات جن میں کوئی ایسی بات مذکور ہو جس کا تعلق اس وقت کی خاص مصلحت سے ہو وہ تمام امت کے لیے لازم نہ ہو۔ ان ارشادات کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ میدان جنگ میں لشکر کی تنظیم و ترتیب کے بارے میں ہدایات دیتا ہے یا دوران جنگ کے لیے کوئی شعار مقرر کرتا ہے۔ یہ احکام وقتی ہوتے ہیں بلکہ اسی جنگ میں جس میں احکامات دیئے گئے ہیں، کوئی مناسب مشورہ سامنے آئے تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے اور احکام بدل دیئے جاتے ہیں۔ جیسے جنگ بدر میں آپ ﷺ نے لشکر کو ایک جگہ اترنے کا حکم دیا۔ حضرت حباب بن منذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا اس جگہ کا انتخاب حکم خداوندی سے ہے یا یہ ایک جنگی تدبیر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک جنگی تدبیر ہے۔ حضرت حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: پھر یہ جگہ مناسب نہیں۔ فلاں جگہ مناسب ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے[xxiv]۔

(v) کوئی خاص حکم اور فیصلہ کیونکہ ایسے احکام میں گواہیوں اور قسموں ہی کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ پس اگر وہ بدل جائیں یا ان سے قوی ذریعہ معلومات سامنے آئے تو حکم بھی بدل جائے

[xxiii] شمائل ترمذی

[xxiv] البدایہ والنہایہ، ج:3، ص:267

گا[xxv]۔

(vi) اس طرح کی بات امام ابن قتیبہؒ نے بھی کی ہے اور اس کی زیادہ تفصیل امام شاطبیؒ کے ہاں مل جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ان تمام قسم کی احادیث / سنن کو عام طور پر ایک قسم سمجھا جاتا ہے مگر انڈونیشی علما احادیث / سنن کی اس تفریق کو مانتے ہیں اور ان کا عمل بھی ان کے مطابق ہے۔ اس لیے انڈونیشی علما عام طور پر مغربی لباس / مقامی لباس پہنتے ہیں۔ داڑھی نہیں رکھتے چونکہ ان کے ہاں حضور نبی پاک ﷺ کا لباس اور داڑھی سنت تشریعی نہ تھی بلکہ سنت عادیہ تھی۔

یہ کچھ ایسے اصول ہیں کہ انڈونیشی علما اپنی تعبیرِ دین میں جن کی رعایت رکھتے ہیں۔ یہ وہ امور ہیں کہ مذہبی مسائل کے تعین و تنفیذ کے وقت وہ جن کا لحاظ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی دینی تعبیر نہ صرف معاشرے میں قبول کی جارہی ہے بلکہ اس سے امن اور ترقی ملی ہے۔

6- فکری اجتہاد کی ضرورت

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی میں ثبات و تغیر ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں یہ امر اسلام کے بارے میں بھی ایک حقیقت کے طور پہ موجود ہے۔ بعض اصول مستقل نوعیت کے ہیں اور انہیں قرآنی اصطلاحات میں 'محکمات' کہا جاتا ہے۔ جیسے توحید، نبوت، آخرت اور انسانی وقار، یہ دائمی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہوسکتا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اس دائمیت کے ساتھ ساتھ بعض ایسی چیزیں ہیں جن میں زمانہ گزرنے سے تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں بنی نوع انسان کی بقاء اور ارتقاء کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اسلام نے تبدیلیوں سے عہدہ برائی کے لیے اجتہاد کا تصور دیا ہے تاکہ ہم تہذیب انسانی کی تیز رفتار پیش قدمی کا ساتھ دے سکیں۔ یہ تبدیلیاں سائنسی، معاشرتی، اقتصادی اور فلسفیانہ آراء کے ارتقاء کی روشنی میں ہو رہی ہیں۔ نامور سیاستدان و مدبر، شاعر اور سکالر علامہ اقبال اس تصورِ اجتہاد کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

[xxv] رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ، ج:2، ص:448

'ہمہ قسم کی زندگی کی حتمی روحانی بنیاد جیسا کہ اسلام نے متشکل کی ہے لافانی ہے اور اپنا اظہار تنوع اور تغیر میں کرتی ہے۔ حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی معاشرے کو اپنی زندگی میں دوام اور تغیر کی اقسام کے ساتھ لازماہم آہنگی اختیار کرنی چاہیے۔اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کو باقاعدہ باضابطہ بنانے کے لیے لازماغیر متبدل اصول ہونے چاہئیں۔کیونکہ ان کا غیر متبدل ہونا مسلسل متغیر ہونے والی دنیا میں ہمیں قدم جمانے کی جگہ مہیا کرتا ہے۔دائمی اصولوں کے بارے میں جب یہ سمجھ لیا جائے کہ انہوں نے تغیر کے جملہ امکانات کو خارج کر دیا ہے جو کہ ازروئے قرآن کریم اللہ تعالی کی بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے تو یہ ایک ایسا میلان ہوتا ہے جو اس چیز کو ساکن کر دیتا ہے جو اپنی فطرت میں اساسی طور پہ متحرک ہوتا ہے۔یورپ کی سیاسی اور معاشرتی علوم میں ناکامی اول الذکر اصول کا اظہار کرتی ہے، جبکہ اسلام میں جمود جو کہ گزشتہ پانچ سو سال رہا، مؤخر الذکر اصول کا اظہار کرتا ہے۔پھر اسلام کی ساخت میں جو اصولِ حرکت ہے اسے اجتہاد کہا جاتا ہے۔

اجتہاد کا مطلب یہ نہیں کہ نیا مذہب تخلیق کیا جارہا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے مستقل اصولوں کی تعبیر کرنا اور انہیں ہر عہد میں لاگو کرنا ہے۔اجتہاد محض ایک فنی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ انسانی ضرورت اور زمانے کا تقاضا ہے۔حضرت ابو اسحاق شاطبیؒ نے اپنی معروف کتاب 'الموافقات' میں لکھا ہے کہ اجتہاد کی ضرورت تاقیامت رہے گی۔کیونکہ انسان نے شریعت پر عمل کرنا ہے(الموافقات فی اصول الشریعہ :63)شریعت بنیادی اور وسیع تر اصول فراہم کرتی ہے لیکن چیزیں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ایسے مسائل کے حل کے لیے شریعہ کے بنیادی اور وسیع اصولوں کی نئی تعبیر اور ان کے اطلاق کے طریقوں کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔

ہمیں عہد حاضر میں عمومی اور کلی اجتہاد کی ضرورت ہے، جس کے نتیجے میں فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید

کی ضرورت ہے۔ حضرت اقبال نے 1929ء میں اپنی کتاب "فکر اسلامی تشکیل جدید"[xxvi] میں اس عظیم کام کو شروع کیا۔ عہد حاضر شدید تقاضا کرتا ہے کہ اس تشکیل جدید کے عمل کو جلد از جلد آگے بڑھایا جائے تشکیل جدید کلی اجتہاد سے ہوتی ہے۔

اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شخصیت پرستی ہے۔ مسلمان سابق ادوار کی شخصیات کے فیصلوں اور ان کی آراء سے انحراف نہیں چاہتے۔ وہ ذہنی اور علمی تنقید کی حوصلہ فزائی نہیں کرتے اور نہ اس کی حمایت کر سکتے ہیں۔ تاہم اس قسم کا طرز عمل اسلام کے دور اول میں نہیں ملتا۔ ہماری فقہ کی ابتدائی تاریخ ایسی عصبیت کی عکاسی نہیں کرتی حالانکہ اول اسلام ایسا نہ تھا۔ اول فقہ میں ایسا نہ تھا۔ حضرت امام ابو حنیفہ کے شاگردوں نے پچاسی فیصد معاملات میں استاد سے اختلاف کیا اور آج کل فقہ حنفی امام ابو حنیفہ کے شاگردوں کی آراء پر قائم ہے[xxvii]۔ شاید اس سے بھی زیادہ نمایاں بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس امر کی کافی مثالیں ہیں جن میں صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اختلاف کر کے آپ ﷺ سے تبادلہ خیال کیا اور اپنی آراء پیش کیں۔

جہاں اجتہاد نہیں ہوتا وہاں زوال بلکہ تباہی آتی ہے۔ سید ابوالحسن علی ندوی ترکوں کی سلطنت کے زوال کے اسباب بارے لکھتے ہیں:

"سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا۔ جمود بھی دونوں طرح کا۔ علم و تعلیم میں میں بھی جمود اور فنونِ جنگ اور عسکری تنظیم و ترقی میں بھی جمود۔ قرآن مجید کی آیت (الانفال: 60) انہوں نے بالکل فراموش کر دی: مسلمانوں، جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اپنا ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ تعالی کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ان کے

[xxvi] The Reconstruction of Religious Thought in Islam

[xxvii] خطبات بہاولپور، ص:92

حافظہ سے گویا محو ہو گیا تھا کہ "دانائی کی بات مؤمن کا گم شدہ مال ہے، جہاں اس کو مل جائے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے"[xxviii]۔ ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ ان کو فاتح مصر حضرت عمو بن العاصؓ کی وصیت ہمیشہ پیش نظر رکنی چاہیے تھی جو انہوں نے مصر کے مسلمانوں کو دی تھی کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو۔ ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہو۔ اس لیے تم کو ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہیے۔ کیونکہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں"۔

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے دینی و علمی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار ہے۔ دماغ تھکے تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی ہیں۔ اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی ہجری سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتدا نہ کریں تو اس میں شک نہیں کہ نویں صدی ہجری وہ آخری صدی ہجری تھی جب جدتِ فکر، قوتِ اجتہاد اور ادب و شاعری، حکمت و فن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں۔

آج کے دور میں انڈونیشی تعبیر کو بہت اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ مسلم دنیا، بالخصوص پاکستانی مذہبی طبقے کے لیے ایک نمونہ ہے جس سے ہم سیکھ سکتے ہیں کہ عصر حاضر میں کس طرح عوامی سطح پر دین اور دینی ادار کو مقبول بنائے رکھنا ہے، کس طرح لوگوں کو دین کے ساتھ جوڑ کے رکھنا ہے، رواداری کو جگہ دینی ہے اور غیر امتیازی معاشرے کی تشکیل کرنی ہے۔ دیکھا جائے تو انڈونیشی علما اور عوام دین کی کسی نص کی مخالفت نہیں کرتے، کسی مظہر کو پس پشت نہیں ڈالتے۔ اس کے ساتھ مگر انہوں نے ایسے مذہبی فہم کو فروغ دیا ہے جس میں توسع ہے اور بے جا سختی نہیں ہے اور وہ عصری تقاضے پورے کرتی ہے۔ ان کی اسی تفہیم کے سبب معاشرے میں اسلام کا احترام کیا جاتا ہے، سماج میں توازن، رواداری اور ترقی کا عمل جاری ہے، علماء کا احترام کیا جاتا ہے، دینی تعلیم کا احترام کیا

[xxviii] کنز العمال، رقم الحدیث: 8542

جاتا ہے۔ انڈونیشی علماء نے کلی اجتہاد کے فریضے کو انجام دے کر اسلام اور اپنے سماج کی بہت خدمت کی ہے۔ وقت ہے کہ ہم انڈونیشی اسلام سے سیکھیں اور اپنے سماج میں امن، رواداری اور ترقی کے لیے کردار ادا کریں۔

دوسرا اسلام

خورشید ندیم[i]

انڈونیشیا کے مسلمان جس اسلام پر ایمان لائے ہیں، کیا وہ کوئی اور اسلام ہے؟

چند روز سے جکارتہ میں ہوں اور یہ سوال میرا ہم قدم ہے۔ سچ پوچھئے تو 2004ء سے میں اس سوال سے پیچھا نہیں چھڑا سکا، جب میں پہلی مرتبہ انڈونیشیا گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی یہاں آیا، یہ سوال میرے ساتھ تھا۔ ہر نئی ملاقات اس سوال کو زندہ کر دیتی ہے۔ اس بار ایسا کیا ہوا، میں بیان کر دیتا ہوں۔

نہضۃ العلماء اور محمدیہ یہاں کی دو بڑی مذہبی جماعتیں ہیں۔ دونوں ریاست کے سیکولر تشخص پر یقین رکھتی ہیں۔ ان کو ہم بھارت کی جمعیت علمائے ہند اور جماعت اسلامی کے مثل قرار نہیں دے سکتے کہ وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اقلیتوں کو ایک غیر مذہبی حکومت ہی بہتر دکھائی دیتی ہے۔ انڈونیشیا میں تو مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ چیئرمین نہضۃ العلماء کو نو مسلم عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ انڈونیشیا کی کم و بیش ستاسی فیصد آبادی مسلم ہے اور اس میں سے ساٹھ فیصد نہضۃ العلماء سے وابستہ ہے۔ اتنی غیر معمولی اکثریت رکھتے ہوئے یہ جماعت ریاست کے مذہبی تشخص کی قائل نہیں ہے۔

نہضۃ العلماء ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ انڈونیشیا کی تاریخ میں ایک سیاسی اتحاد 'ماشومی' کے نام سے بنا تھا جو سیاست میں متحرک تھا۔ اس اتحاد میں نہضۃ العلماء اور محمدیہ دونوں شامل تھیں۔ دونوں نے بعد میں

---

[i] معروف کالم نگار اور محقق ہیں۔ مذہبی و سماجی امور پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اِس وقت 'رحمت للعالمین و خاتم النبیین تھارٹی' کے چیئرمین ہیں۔ یہ مضمون روزنامہ دنیا میں شائع ہوا۔

سیاست سے دستبرداری اختیار کی اور خود کو سماج کی اخلاقی تعمیر تک محدود کر لیا۔ دونوں نے ملک میں جتنے تعلیمی و فلاحی ادارے قائم کیے، عوام کی دینی اور مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے کام کیا اور اس وقت جتنے مذہبی مدارس ان کے زیر اہتمام قائم ہیں، ان کے اعداد و شمار حیران کن ہیں۔ اتنے غیر معمولی اثر و رسوخ اور فلاحی منصوبوں کے باوجود یہ دونوں جماعتیں ریاست کو مذہبی بنانے میں نہ صرف سنجیدہ نہیں ہیں بلکہ اسے انڈونیشیا کے لیے مضر سمجھتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

یہ جماعتیں دین انہی ماخذ سے کشید کرتی ہیں جن سے ہم دین لیتے ہیں۔ قرآن اور سنت ان کے نزدیک بھی دین کا سرچشمہ ہیں۔ دین ان کے ہاں بھی پانچ ارکان پر کھڑا ہے۔ ختمِ نبوت بھی دونوں کے عقیدے کا حصہ ہے۔ مذہبی اعتبار سے وہ قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ اس کے باوجود وہ دین کی جو تعبیر کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں ریاست و سماج کے معاملے میں وہ ہم سے مختلف موقف کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اس بار میں جب محمدیہ کی عالمات سے ملا تو ان کے دینی علم کو قابلِ رشک پایا۔ محمدیہ کے اہلِ علم کا تفسیر کے باب میں یہ نقطۂ نظر ہے کہ یہ تین طرح سے کی جاتی ہے: بیانی، رحمانی اور عرفانی۔ بیانی جو متن کا فہم ہے۔ رحمانی جو عقلی استدلال رکھتی ہے اور عرفانی جو دین کی اجتماعی حکمت اور اس کی روح کو بیان کرتی ہے۔ ان جماعتوں کے مذہبی علما سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تفسیر کے باب میں ایک اصول قراۃ مبادلہ (Reciprocal Reading) کا ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ متن کو اگر آپ مرد کے نقطۂ نظر سے پڑھ رہے ہیں تو قراۃ مبادلہ یہ ہے کہ اسے عورت کی نظر سے بھی دیکھا جائے۔ اس طرح قرآن مجید کے ایک متوازن فہم اور شرح تک پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے۔ یہاں خواتین کو کسی طرح مردوں سے کم تر نہیں سمجھا جاتا۔ دینی حوالے سے اس بات کی تفہیم کے لیے ان کا خیال ہے کہ یہ اصول اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی تفسیر اس وقت میرا موضوع نہیں۔ مجھے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ دینی ستون کو سمجھنے کے لیے یہاں کے علما کا زاویۂ نظر ہم سے بہت مختلف ہے۔

خواتین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مفعولانہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ نہضۃ العلماء کے زیر اہتمام خواتین علما کی ایک تنظیم کوپی (Kupi) قائم ہے۔ اسے تنظیم نہیں بلکہ ایک تحریک قرار دیا گیا ہے۔ جب ہم 'علما' کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں مرد علما کا تصور ابھرتا ہے۔ یہ تحریک اس

صفت کو صنفی اعتبار سے بلند کرتے ہوئے عام کرنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ 'علما' خواتین بھی ہو سکتی ہیں' اس لیے اب خواتین مردوں کی شرح اور تفسیر کی محتاج نہیں۔ وہ خود دین کا علم حاصل کریں گی اور دینی نصوص کی شرح کریں گی۔ یہ تنظیم خواتین علما کی دو بڑی کانفرنسوں کا انعقاد کر چکی ہے تاکہ وہ خواتین کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کیلئے حکمت عملی وضع کریں۔

عالمات پاکستان میں بھی موجود ہیں لیکن وہ اس نظامِ تعلیم کا حصہ ہیں جو پہلے سے قائم ہے اور ظاہر ہے کہ مردوں کا بنایا ہوا ہے۔ ان خواتین کا الگ سے کوئی تشخص نہیں ہے۔ نہ علمی' نہ انتظامی۔ 'کوپی' ایک متبادل نظام بھی ہے اور طرزِ فکر بھی۔ مجھے ان خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا دینی علم قابلِ رشک اور اعتماد' سچ پوچھئے تو خوف زدہ کر دینے والا ہے۔ ایک مجلس میں جب ایک خاتون عالمہ نے سورۃ النساء کی آیت نمبر 36 کی شرح کی جس میں مردوں کو خواتین کا 'قوام' قرار دیا گیا ہے' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف عربی صرف و نحو سے بخوبی واقف ہے بلکہ اپنی تفسیری روایت سے بھی با خبر ہے۔ وہ جب اس آیت کی شرح کو تفسیر بالقرآن کے اصول پر بیان کر رہی تھی کہ کیسے قرآن کی بعض آیات' دوسری آیات کی تفسیر کرتی ہیں تو سامعین کی حیرت دیدنی تھی۔

ان مذہبی جماعتوں کے خواتین و حضرات کی دین سے عملی وابستگی بھی متاثر کن ہے۔ ان کے ہاں عبادت کا اہتمام ہے۔ مساجد خوبصورت اور صاف ستھری ہیں۔ ان کے دروازے جس طرح مردوں کے لیے کھلے ہیں' عورتوں کے لیے بھی اسی طرح وا کئے گئے ہیں۔ ایک مدرسے میں جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ بچے اور بچیاں مختلف کمروں میں' لیکن ایک ہی عمارت میں دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ نماز کے بعد مسجد میں بچے اور بچیاں ذکر و اذکار کر رہے ہیں۔ یہ منظر بھی بہت متاثر کن تھا۔ میں جب ان کے فہمِ دین کے اصول اور ان سے ماخوذ نتائجِ فکر کو دیکھتا ہوں' ان کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرتا ہوں تو مجھے خود سے بہت مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے مدارس فی الجملہ جیسی شخصیات پیدا کرتے ہیں' وہ ان سے یکسر مختلف ہیں جو انڈونیشیا کے مدارس پیدا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ فقہی اعتبار سے امام شافعی کے مقلد ہیں' اس لیے انہیں 'متجدد' کہہ کر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر سب ایک ہی منبع سے فیض یاب ہیں تو وہ ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ ایک ہی پودے پر لگنے والے

پھول اپنی خوشبو اور رنگ میں مختلف کیسے ہو سکتے ہیں؟

میرے علم اور مشاہدے میں بہت سے خیالات ایسے بھی ہیں کہ انہیں پاکستانی معاشرے میں بیان کیا جائے تو لوگ حیرت سے دانتوں میں انگلیاں داب لیں یا ہاتھ میں پتھر اٹھالیں۔ میں اس وقت یہ سوال نہیں اٹھا رہا کہ دونوں میں سے غلط کون ہے اور صحیح کون؟ میں تو صرف یہ واضح کر رہا ہوں کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا بیان کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں اور سب اسلام ہی ہیں۔ کیا ان فاصلوں کو کم کیا جا سکتا ہے؟ میرا جواب اس بات میں ہے، کہ اس کا طریقہ مکالمہ ہے۔

لازم ہے کہ ہمارے اور انڈونیشیا کے علما کے مابین گفتگو ہو۔ تبادلۂ خیال ہو اور وہ ایک دوسرے کے دلائل کو خندہ پیشانی کے ساتھ سنیں۔ وحی کا دروازہ بند ہو چکا۔ اب جو کچھ کہے گا وہ دلیل کی بنیاد پر پرکھا جائے گا۔ دین کے باب میں دلیل قرآن اور سنت ہی ہیں۔

اس سفر میں مجھے ایک بار پھر جکارتہ کی مسجد استقلال جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہاں کے خطیب اعظم سے تفصیلی گفتگو ہوئی، معلوم ہوا کہ یہ محض ایک مسجد نہیں، ایک نظام ہے۔ ایسا نظام کہ اس کی تفصیلات آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ حیرت کے دروازے کو میں اس وقت بند ہی رکھنا چاہتا ہوں۔

جی نہیں، اسلام ایک ہی ہے[i]

ڈاکٹر حسین احمد پراچہ

برادرِ مکرم جناب خورشید ندیم اِن دنوں انڈونیشیا کی علمی و دینی سیاحت سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ جکارتہ سے ہی انہوں نے ایک کالم بعنوان ''دوسرا اسلام'' تحریر فرمایا ہے۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ فاضل کالم نگار انڈونیشیا کی دینی سرگرمیوں سے بہت فرحاں و شاداں ہیں اور انہیں قابلِ رشک گردانتے ہوئے پاکستان میں اسی دینی ماڈل کی تقلید کے خواہاں ہیں۔ پہلے ان کے کالم کا مختصر پس منظر جان لیجئے۔ 87 فیصد مسلم آبادی والے ملک انڈونیشیا کی دو بڑی مذہبی جماعتوں نہضۃ العلماء اور محمدیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے خورشید ندیم صاحب نے لکھا ہے کہ کئی برس سے ان جماعتوں نے خود کو مدارس میں تعلیم و تربیت اور مساجد میں خشوع و خضوع سے عبادت اور ذکر اذکار تک محدود کر لیا ہے۔

ان دینی جماعتوں نے سیاست کو اپنے لیے شجرِ ممنوع قرار دے لیا ہے۔ کالم کا لب لباب یہ ہے کہ انڈونیشیا کی دونوں بڑی مذہبی جماعتیں ریاست کے سیکولر تشخص پر یقین رکھتی ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں ریاست کو مذہبی بنانے میں نہ صرف سنجیدہ نہیں بلکہ اسے انڈونیشیا کے لیے نقصان دہ سمجھتی ہیں۔ فاضل کالم نگار کا کہنا یہ ہے کہ یہ دو جماعتیں قرآن و سنت کو دین کا سرچشمہ مانتی ہیں، ہم بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ تو پھر ہماری مذہبی جماعتیں کس بنیاد پر ریاست کے دینی تشخص کے لیے اصرار کرتی ہیں؟ دوسری اہم بات برادرِ گرامی نے یہ بیان کی ہے کہ انڈونیشیا کی دینی شعور رکھنے والی خواتین معاشرے میں ایک متحرک اور ایکٹو کردار ادا کر رہی ہیں۔ وہاں کے دینی اداروں سے فارغ التحصیل

---

[i] جب خورشید ندیم صاحب نے 'دُوسرا اسلام' کے نام سے مضمون لکھا تو اس کا جواب میں ڈاکٹر حسین احمد پراچہ نے یہ مضمون لکھا جو روزنامہ دنیا میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر حسین احمد پراچہ نامور کالم نگار اور دانشور ہیں۔ سیاسیات و سماجیات کے ماہر ہیں۔

ہونے والی عالمات کا دینی علم اور اُن کا اعتماد قابلِ رشک ہے۔ تیسری بات انہوں یہ تحریر کی ہے کہ وہاں کی مساجد نہایت صاف ستھری اور نگاہوں میں سما جانے والی ہیں۔

مجھے حیرت ہے کہ قرآن و سنت کو اپنے دینی ماڈل کا منبع و مصدر تسلیم کر کے کوئی صاحبِ علم مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والے ملک کے لیے سیکولر نظامِ حکومت کی تائید و حمایت کیسے کر سکتا ہے اور اپنی دینی و مذہبی سرگرمیوں کو محض ذکر و فکر اور عبادات تک کیسے محدود کر سکتا ہے۔ فکرِ اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خالقِ ارض و سما اپنے نبی ﷺ کو یہ دعا سکھاتا ہے ''اور دعا کرو! اے پروردگار مجھ کو جہاں بھی تُو داخل کر، سچائی کے ساتھ داخل فرما اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے''۔ عصرِ حاضر کے عظیم مفکر اور مفسرِ قرآن مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے اس آیت کی یوں تشریح کی ہے کہ یا خدا! تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں۔

مغرب میں لادین ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی بنا پر پروان چڑھا۔ وہاں کلیساؤں کے پادریوں نے بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے خلقِ خدا پر شدید مظالم ڈھائے تھے، اس کے ردِ عمل میں سیکولرازم کی تحریک کا 1832ء میں آغاز ہوا۔ بعد ازاں سیکولرازم کو مغرب میں جمہوریت کے جزو لاینفک کے طور پر قبول کر لیا گیا۔

اگرچہ عرب و غیر عرب اسلامی دنیا کے اکثر ممالک میں ملوکیت اور آمریت کا راج ہے اور وہاں کی دینی جماعتوں کا سیاست میں کوئی کردار نہیں، تاہم فاضل کالم نگار کے غیر سیاسی مذہبی ماڈل کے مسلم معاشروں پر تباہ کن اثرات واضح کرنے کے لیے میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ تیونس میں حبیب بورقیبہ نے فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک پر 1956ء سے لے کر 1987ء تک ایک آمرِ مطلق کے طور پر حکومت کی۔ حبیب بورقیبہ نے اپنی ڈکٹیٹر شپ کے بل بوتے پر مسلم اکثریت والے ملک پر رمضان کے روزوں، عیدالاضحی کی قربانیوں اور دیگر کئی شعائرِ اسلام کو ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ یہ طالب علم عرب لیگ پر اپنی پی ایچ ڈی کے سلسلے میں 1980ء کی دہائی کے اواخر

میں تیونس گیا تو اس وقت وہاں حبیب بورقیبہ کا اقتدار ختم ہو چکا تھا اور اس کے ہی وزیر اعظم زین العابدین کے ہاتھ میں کسی جمہوری عمل کے بغیر زمامِ حکومت آگئی تھی۔ زین العابدین نے بھی اپنے پیش رو کے خلافِ اسلام کلچر کو جاری و ساری رکھا۔ ایک مسلم معاشرے میں لادینی آمرانہ حکومت کی مکمل تصویر میرے سامنے اپنے قیام کی پہلی شام کو ہی آگئی تھی۔ جب ریستوران میں ویٹر نے میرے سامنے لا کر مینو کارڈ رکھا تو اس پر واضح عربی میں لکھا تھا "اللحم الخنزیر"، اس پر الکحل کی کئی اقسام بھی درج تھیں۔ آپ کے پردیسی کالم نگار کو تیونس میں اپنے قیام کی پہلی شب پھلوں پر ہی گزر اوقات کرنا پڑی۔ ایک زبردست عوامی تحریک کے نتیجے میں زین العابدین کو تیونس سے فرار ہونا پڑا۔ اس کے بعد 2011ء میں تیونس میں پہلے آزادانہ انتخابات میں وہاں کی اسلامی پارٹی حرکۃ النہضۃ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس پارٹی نے برسر اقتدار آکر ملک سے آمریت اور لادینی کلچر کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

میں بصد ادب فاضل کالم نگار اور انڈونیشیا کی مذہبی جماعتوں سے استفسار کرتا ہوں کہ اُن کی طرح اگر تیونس کی حرکۃ النہضۃ پارٹی بھی صرف دینی مدارس اور خانقاہوں میں ذکر و فکر تک محدود ہوتی اور سیاست میں حصہ نہ لیتی تو پھر نہ جانے اور کتنی دہائیوں تک یہ مسلم معاشرہ لادینی کلچر کی چتا میں جلتا رہتا۔ تبھی تو مرشد اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ لادینی قوتیں یہ چاہتی ہیں کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

جناب مصطفیٰ ﷺ نے محض 23 برس کی جدوجہد میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا کہ جس سے نہ صرف عدل و انصاف کے آسمانی قوانین کے مطابق ریاستِ مدینہ قائم ہوئی بلکہ دنیا کی ہر قابلِ تصور و ناقابلِ تصور معصیت میں مبتلا عربوں کے دلوں کی دنیا ہی بدل گئی۔ یہ عظیم انقلاب قوت و ریاست کے بغیر کیسے برپا کیا جا سکتا تھا۔ دورِ جدید میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا راستہ روکنے کے لیے مغرب نے ایک نہیں، کئی اسلام متعارف کرائے ہیں۔ ایک صوفی اسلام، دوسرا سیاسی اسلام، تیسرا جہادی اسلام اور چوتھا بنیاد

پرست اسلام وغیرہ۔ دراصل یہ اصطلاحات مختلف اہداف کی خاطر وضع کی گئی ہیں۔ صوفی اسلام کو قابلِ تعریف بنا کر پیش کیا گیا تاکہ مسلم معاشروں کو مدرسوں اور خانقاہوں تک محدود کر دیا جائے۔ سیاسی اسلام کو قابلِ تنقید بنا کر پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلم معاشروں میں جہاں جہاں جمہوریت کے راستے اسلامی حکومتیں قائم ہو رہی ہیں، اُن کا راستہ روکا جائے۔

جہاں تک انڈونیشیا میں خواتین میں علم و اعتماد کا تعلق ہے تو یہ قابلِ تحسین ہے۔ اسی طرح عورتوں کو یقیناً ہر اسلامی سوسائٹی میں ایک متحرک اور فعال کردار ادا کرنا چاہیے اور انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ دینی و دنیاوی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونا چاہیے۔ مساجد کی صفائی ستھرائی اور تزئین و آرائش قابلِ تقلید ہے، تاہم انڈونیشین علما کا ریاست کے سیکولر تشخص پر یقین کسی طرح بھی قرآن و سنت کے مطابق نہیں۔ اسی طرح مذہبی جماعتوں کی سیاست سے دستبرداری بھی مطلوبِ اسلام نہیں۔ انڈونیشیا کی مذہبی جماعتوں کو ایک بار پھر اسلامی تعلیمات کو ری وزٹ کر کے اپنے تصورِ دین کو روحِ اسلام کا عکاس بنانا چاہیے۔ انڈونیشیا کا مذہبی ماڈل پاکستان کے لیے ہرگز قابلِ تقلید نہیں۔

جناب خورشید ندیم نے کالم کی ابتدا ایک سوال سے کی تھی۔ سوال ملاحظہ کیجئے: انڈونیشیا کے مسلمان جس اسلام پر ایمان لائے ہیں، کیا وہ اور اسلام ہے؟ اس سوال کا جواب حاضر ہے۔ جی نہیں، اسلام ایک ہی ہے مگر انڈونیشیا کے علما نے اسلام کی تعبیر درست نہیں کی۔

انڈونیشیا کا اسلام[i]

خورشید ندیم

برادرِ محترم ڈاکٹر حسین احمد صاحب پراچہ کا بہت شکریہ اور ان کے لیے دعا۔

ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف میرے کالم کو توجہ سے پڑھا بلکہ اس کا تجزیہ بھی کیا۔ اس کے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو اس بحث کا دوسرا زاویہ سامنے آیا جو میرے کالم کا حصہ نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ اس مکالمے کو آگے بڑھانے کا ایک موقع پیدا ہوا' میرا کالم جس کا نقطہ آغاز بنا ہے۔ میں مناظرے کا نہیں' مکالمے کا آدمی ہوں۔ میرے نزدیک ہر ایسی کوشش محمود ہے جس سے سماج میں غور و فکر کے نئے در وا ہوتے ہوں اور فکری ارتقا کا امکان پیدا ہو۔ یہ مکالمے ہی سے ممکن ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تبصرے نے اس مکالمے کو ممکن بنا دیا۔ میں اس موضوع کو دو پہلوؤں سے آگے بڑھانا چاہتا ہوں' ڈاکٹر صاحب نے جن کا ذکر کیا۔

پہلی بات تو یہ کہ انڈونیشیا کی جماعتوں نے اقتدار کی سیاست سے کنارہ کشی کرتے ہوئے' خود کو محض ذکر و فکر اور عبادت تک محدود نہیں کیا۔ انہوں نے سماجی تبدیلی کا ایک متبادل لائحہ عمل دیا جو زیادہ جامع بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ انہوں نے ریاست کے بجائے سماج کو اپنی تبدیلی کا محور بنایا۔ دوسرے الفاظ میں سیاسی تبدیلی کے بجائے' اپنی کاوشوں کو سماجی تبدیلی کے لیے وقف کر دیا۔ اس سے ان کے عمل کا دائرہ محدود نہیں' وسیع ہوا ہے۔

تفصیل کا موقع نہیں' میں بس ایک پہلو کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔ نہضۃ العلما کا کہنا ہے کہ انہیں خیرِ

---

[i] ڈاکٹر حسین احمد پراچہ صاحب کے جواب میں روزنامہ دنیا میں لکھا گیا مضمون۔

امت بننا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسی منصب پر فائز کیا ہے اور انہیں خود کو اس کا اہل بنانا ہے۔ امت کسی سیاسی تجسیم کا نام نہیں، یہ دراصل ایک برادری ہے۔ ہمیں ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصولوں پر قائم ہو۔ نہضۃ العلما کا کام اہلِ اسلام کو اس کے لیے تیار کرنا ہے۔

یہ کام پلک جھپکنے میں ہونے والا نہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ ایک مسلمان 'مبادی خیرِ امت' کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنائے۔ بعض تجربات سے گزرنے کے بعد، وہ اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے اخذ شدہ اصولوں پر فرد کی تعمیر سے ہم خیرِ امت بن سکتے ہیں۔ یہ اس کے مبادی یا اساسات ہیں۔ زوال کا سبب ان سے دوری ہے۔ یہ اساسات تین ہیں: ایک 'الصدق'۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیشہ وہی کریں جو درست ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولیں الا یہ کہ کسی بڑے سماجی فائدے کے لیے دین نے اسے روا رکھا ہو۔ دوسری اساس ہے 'الامانۃ ووفا بالعہد'۔ ایفائے عہد، ہر کسی کے ساتھ اور امانت کی پاسداری۔ تیسری اساس ہے 'التعاون'۔ خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون۔

نہضۃ العلما کے لٹریچر میں اس کی شرح کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر امانت سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ہر عہد کی پاسداری کرنی ہے۔ یہ انفرادی سطح پر ہوگا اور اجتماعی سطح پر بھی۔ لیڈر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کارکنوں سے ایفائے عہد کرے۔ شہری ریاست سے اپنا عہد نبھائے۔ جو عہد توڑتا ہے، وہ دراصل نفاق کا اظہار کرتا ہے۔ جس آدمی میں یہ صفات ہوں گی، وہ کسی منصب پر بیٹھنے کا اہل ہوگا اور نہ اسے کوئی بڑی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے۔ جب لوگوں میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں گی تو پھر وہ خیرِ امت ہوں گے۔ یہ سیاست کی بالواسطہ اصلاح ہے۔

اس کے لیے انہوں نے تربیت اور تعلیم کا ایک وسیع نظام تشکیل دیا ہے۔ ہزاروں درس گاہیں قائم ہیں۔ ان کے کئی درجے ہیں۔ جن میں سے ایک مدرسہ ہے۔ صدر سکارنو نے جب 'نیو آرڈر' متعارف کرایا تو تعلیم کے نظام میں دوئی کو ختم کر دیا۔ اس پر نہضۃ العلما نے ردِ عمل کا اظہار کیا اور مذہبی تعلیم کا دفاع کیا۔ تاہم بعد میں، کسی تصادم میں پڑے بغیر، دینی تعلیم کے نظام کو ریاستی نظامِ تعلیم سے ہم

آہنگ بنا دیا۔ مدرسے کی تعلیم کے کئی درجے ہیں۔ اس کے ساتھ 'پنسنترن (Pesantren)' کا تصور ہے جو اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں کا فارغ التحصیل اس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ وہ کسی حکومتی اور ریاستی منصب تک پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح وہاں دینی اور غیر دینی تعلیم کا یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ دینی مدرسے کا فارغ التحصیل سماج کے لیے اجنبی ہو جائے اور ریاست کے منصب کے لیے اہل نہ سمجھا جائے۔

سیاست بھی لوگوں کے لیے شجرِ ممنوعہ نہیں ہے، اگر وہ انفرادی سطح پر اس کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ وہ چاہیں تو کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو سکتے ہیں۔ انفرادی حیثیت میں بھی سیاست کر سکتے ہیں۔ نہضۃ العلما کے ایک بڑے راہنما اور عالم عبد الرحمان واحد انڈونیشیا کے صدر رہ چکے ہیں۔ بطور عالم، پورے انڈونیشیا میں ان کا بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح محمدیہ کے راہ نما پارلیمان کے سپیکر تھے۔ بطور جماعت، تاہم یہ سیاست کو اپنے لیے مضر سمجھتے ہیں۔

وہ اس بات کے قائل کیسے ہوئے کہ سیاسی جدوجہد ان کے لیے نقصان دہ ہے؟ یہ اس مکالمے کا دوسرا اہم پہلو جس کا محل ڈاکٹر حسین احمد پراچہ صاحب کے کالم سے پیدا ہوا۔ 'نہضۃ العلما' اور 'محمدیہ'، عملی سیاست کر چکے ہیں۔ نہضۃ تو وہاں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ یہ 'ماشومی' کے نام سے قائم ہونے والے سیاسی اتحاد کا حصہ تھے۔ اس تجربے سے انہوں نے سیکھا کہ اقتدار کی سیاست کسی ایسی جماعت کے لیے سازگار نہیں جو خیرِ امت تشکیل دینا چاہتی ہے۔ دعوت و اصلاح کا کام جوہری طور پر سیاسی کام سے مختلف ہے۔

اصلاحی جماعتوں کا کام سیاستدان سمیت، سب طبقات میں وہ اوصاف پیدا کرنا ہے جو انہیں اپنے اپنے منصب اور سماجی و سیاسی کردار کے لیے بہترین انتخاب بنا دے۔ اقتدار کی سیاست کے اپنے مطالبات ہیں جو ایک اصلاحی جماعت پورا نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست دنیا سے جڑی ہے اور دنیا آپ کے اصولوں پر قائم نہیں ہے۔ اس لیے ان کا سیاست سے گریز ایک ایسا فیصلہ ہے جو تجربے کا حاصل اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ ان کا فہمِ دین بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے کالم میں تیونس کی 'نہضہ' کی جو مثال دی' اس کی تاریخ کا آخری باب شاید ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہاں کی نہضہ' انڈونیشیا کی نہضۃ العلما کی طرح سیاست سے توبہ کر چکی۔ اس کے راہ نما اعلانیہ 'سیاسی اسلام' سے اظہارِ برأت کر چکے۔ وہ اب سیاسی اور مذہبی اداروں کو الگ رکھنے کے قائل ہیں۔ اسی کے نتیجے میں نہضہ کے رہنما راشد غنوشی نے 'مسلم ڈیموکریٹس' کے نام سے سیاسی جماعت بنائی ہے جس کا مذہبی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ گویا انڈونیشیا اور تیونس' دونوں مقامات پر ریاست کو مسلمان بنانے کے تجربات کے بعد' وہاں کی مذہبی جماعتیں اس نتیجے تک پہنچی ہیں کہ جدوجہد کا محور ریاست نہیں' سماج کو بنانا چاہیے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے جو مثال اپنی تائید میں پیش کی ہے' وہ ان کے موقف کو غلط ثابت کر رہی ہے۔

انڈونیشیا اور تیونس کی مثالوں میں ہمارے لیے بڑی راہ نمائی ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم تجربات سے سیکھنے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس سوال پر غور تو کیا جانا چاہیے کہ ریاست کو مزید مسلمان بنانے کی کوششوں کا حاصل کیا رہا؟ انڈونیشیا اور پاکستان مختلف کیوں ہیں؟ بارِ دگر عرض ہے کہ انڈونیشیا کا اسلام ذکر اور رسوم کا اسلام نہیں' وہ زندہ اسلام ہے جو سماج کے ہر گوشے پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس کا محور' ریاست نہیں' سماج ہے۔ یہ بات اہلِ علم پر واضح ہے کہ سماج' ریاست سے بڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حسین احمد پراچہ صاحب کا ایک بار پھر شکریہ اور ان کیلئے دعا کہ انہوں نے تنقیحِ مزید کا موقع فراہم کر دیا۔

مسجد یا سسٹم؟[i]

خورشید ندیم

'مسجد استقلال' کے خطیبِ اعظم نے جب اسے 'سسٹم' کا نام دیا تو میں چونکا۔ تفصیل بتائی تو حیرت میں ڈوب گیا۔

جکارتہ میں واقع یہ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اس کا ایک وسیع و عریض ہال ہے۔ مرد اور خواتین اسی ہال میں اکٹھے نماز پڑھتے ہیں، اس اہتمام کے ساتھ کہ درمیان میں علامتی سی تقسیم ہے۔ انڈونیشیا میں خواتین کو نارمل انسان سمجھا جاتا ہے، خطرۂ ایمان نہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں متحرک ہیں۔ اُن پر بازار کا راستہ بند ہے نہ مسجد کا دروازہ۔ اکثر خواتین شائستہ اور باوقار لباس میں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر کوئی نہیں ہے تو لوگ صرفِ نظر کرتے ہیں۔ نہ آنکھیں ان کا پیچھا کرتی ہیں نہ دوسروں کو انہیں مزید ساتر بنانے کی فکر پریشان رکھتی ہے۔

یہ مسجد ایک 'سسٹم' کیسے ہے؟ ایک تو یہ کمیونٹی سنٹر ہے۔ یہاں ورزش کی جگہ بنائی گئی ہے۔ تقریبات ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ تعلیم کا اہتمام ہے۔ مسجد کی انتظامیہ نے بلاسودی کاروبار کا ایک نظام وضع کیا ہے جس میں لوگ سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ یہ کاروباری سرگرمیاں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا سب سے اہم پہلو دیگر مساجد کے آئمہ و خطبا کو روزگار کی سہولت فراہم کرنا ہے۔

دیگر مسلم ممالک کی طرح یہاں بھی دو طرح کی مساجد ہیں۔ ایک جامع مسجد ہے اور ایک مصلیٰ۔

---

[i] بشکریہ: روزنامہ دنیا

جامع مسجد وہ ہے جہاں نمازِ جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس کیلئے حکومت کی اجازت لازم ہے۔ مصلیٰ عام نماز کی جگہ ہے جو کہیں بھی مختص کی جا سکتی ہے۔ بازاروں، دفاتر اور عوامی مقامات پر لوگ اپنی سہولت کے تحت مصلیٰ بنا لیتے ہیں۔ بالعموم لوگ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ پاکستان شاید عالمِ اسلام کا واحد ملک ہے جہاں جامع مسجد بنانے کیلئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔ جو جہاں چاہے جمعہ کی نماز شروع کر سکتا ہے۔

مسجد استقلال نے ملک بھر کی جامع مساجد کو غیر رسمی طور پر اپنے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ خطبا اور آئمہ کے لیے تربیتی پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔ خطبۂ جمعہ کے لیے موضوع کی کوئی پابندی نہیں مگر مسجد استقلال سے انہیں سال بھر کے لیے موضوعات فراہم کیے جاتے ہیں تاکہ خطبا ان کو پیشِ نظر رکھیں۔ یہ تربیت کی ایک صورت ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات بھی اس 'سسٹم' کا ایک اہم حصہ ہے۔ مسجد کے قریب ایک بڑی مسیحی عبادت گاہ ہے۔ مذہبی ہم آہنگی کے اظہار کے طور پر انہیں ایک سرنگ سے جوڑا گیا ہے۔ مسجد کے پاس وسیع پارکنگ ہے۔ جب مسیحیوں کی کسی بڑی تقریب کا موقع ہوتا ہے تو اس پارکنگ کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا میں مسلم غیر مسلم تعلقات مثالی ہیں۔ اس میں ریاست کی حکمتِ عملی کے ساتھ مذہبی جماعتوں اور مسجدِ استقلال جیسے 'سسٹم' کا اہم کردار ہے۔

اس مسجد نے دنیا بھر کے اسلامی اداروں کے ساتھ بھی تعلق قائم کر رکھا ہے۔ خطیب صاحب پاکستان کے ساتھ بھی ایسے مؤثر تعلق کے خواہاں تھے۔ انہیں اسلامی مالیات اور معیشت کے ماہرین کی ضرورت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس ضمن میں پاکستان ان کا مددگار ہو سکتا ہے۔ انہیں افسوس تھا کہ اسلامی علوم کے جیسے ماہرین غیر مسلموں میں ہیں، مسلمانوں میں نہیں۔ ان کا تاثر تھا کہ جو شراب پیتا ہو اور نماز جیسی عبادت سے دور ہو، اس کے علم میں برکت نہیں ہوتی۔ کیا اچھا ہو کہ علومِ اسلامیہ کے ایسے سکالرز ہوں جو کردار میں بھی اس کا نمونہ ہوں۔

اس سسٹم کا اپنا تعلیمی نظم بھی ہے۔ یہ ملک کے نظامِ تعلیم اور نصاب سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے تحت

طلبہ و طالبات کو دین سکھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس قابل بھی ہوتے ہیں کہ آسانی کے ساتھ ریاستی نظام کا حصہ بن سکتے ہیں۔ یہ انڈونیشیا کی عمومی دینی تعلیمی کا خاصا ہے جو اس سسٹم میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ محض ایک مسجد نہیں بلکہ ایک سماجی ادارہ ہے جس کے لیے سسٹم کا لفظ موزوں ہے۔

ہم جس خطیبِ اعظم سے ملے، ان کی داڑھی نہیں تھی۔ انڈونیشیا میں شوافع کی اکثریت ہے۔ وہاں داڑھی کے بارے میں وہ حساسیت نہیں ہے جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہے۔ وہاں کے اکثر علما کی داڑھی نہیں ہے اور معاشرے میں اسے عالمِ دین کے لیے لازمی شرط کے طور پر نہیں دیکھا جاتا۔ نہضۃ العلما اور محمدیہ کے علما کا معاملہ بھی یہی ہے۔ تاہم نماز اور دیگر عبادات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ان علما میں دین کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ عام طور پر یہ لوگ ٹوپی کا اہتمام کرتے ہیں۔ سماجی سطح پر ٹوپی شرفا کے لباس کا حصہ ہے۔ علما و عوام ایک ہی طرح کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ یہ جناح کیپ سے ملتی جلتی ہے اور صدر سوکارنو اس کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

مسجد استقلال کے خطیب نے اس سسٹم کے بارے میں ایک اہم بات بتائی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مسجد کے اس کردار کو بحال کرنا چاہتے ہیں جو عہدِ رسالت میں تھا۔ نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مسجد 27 کاموں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتی تھی، ہم چاہتے ہیں کہ آج بھی مسجد ان تمام امور کے لیے مرکز بنے۔ ان میں مذہبی اور سماجی نوعیت کے بہت سے کام شامل ہیں۔ ان میں سے بعض کا میں نے اس کالم میں ذکر بھی کیا ہے۔

خطیب صاحب کی گفتگو کے دوران میں مسجد میں گھومتے پھرتے مسلسل سوچتا رہا تھا کہ بچپن سے میں مسجد کے جس تصور سے آشنا ہوں، وہ اس تصور سے اتنا مختلف کیوں ہے؟ یہاں مسجد خواتین کے لیے جائے ممنوعہ ہے۔ دیہات اور شہر، دونوں مقامات پر ہمارا رویہ یکساں ہے۔ مسجد نماز کے علاوہ ایک حد تک دینی تعلیم کی جگہ بھی ہے مگر یہ کسی طرح بھی سسٹم نہیں بن سکی۔ اس پر مستزاد مسلکی جھگڑے ہیں جنھوں نے مسجد کے تقدس ہی کو مجروح نہیں کیا، خود دین کی افادیت پر سوالات اٹھا دیے ہیں۔ اس کا ذمہ دار دین نہیں، ہم ہیں۔

ماضی میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے مسجد میں نکاح کی تحریک اٹھائی تھی۔ یہ ایک اچھا قدم تھا مگر محترم ڈاکٹر صاحب نے اسے شادی بیاہ کی سماجی تقریبات سے وابستہ کرتے ہوئے ایک ایسے پیکیج میں بدل دیا جس نے بحث کو نیا رُخ دے دیا اور مسجد کی مرکزیت کا معاملہ پس منظر میں چلا گیا۔ اگر اصلاحِ رسوم اور مسجد کی مرکزیت کو الگ رکھا جاتا تو شاید دونوں باتوں کی تفہیم آسان ہو جاتی۔

ہمارے ہاں بعض لوگوں نے اپنے طور پر مسجد کے کردار کو مفید تر بنانے کی کوشش کی۔ یہ قابلِ تحسین کوششیں مگر انڈونیشیا کی طرح کلچر نہیں بن سکیں۔ مسجد کی صفائی اس کلچر کا اہم حصہ ہے۔ افسوس کہ ہم اس بارے میں بھی حساس نہیں ہیں۔ حکومت تو اس بات کی جرأت نہیں کرتی کہ مساجد کا رُخ کرے۔ اگر محراب و منبر کے ذمہ داران خود ہی اس جانب توجہ دیں تو ہم مسجد کو ایک سسٹم میں بدل سکتے ہیں۔

'خدا مرکز' سوچ اسی وقت پیدا ہو گی جب سماج 'مسجد مرکز' ہو گا۔ مساجد اللہ کے لیے ہیں۔ جو مسجد اللہ کے لیے نہیں ہے' وہ مسجدِ ضرار ہے۔ جب مساجد اللہ کے لیے خاص ہوتی ہیں تو وہ عباد اللہ کا مستقر بنتی ہیں۔ ہمارے لیے اس حوالے سے معاصر مسلم معاشروں میں بڑا سبق ہے۔ ہمیں ان سے سیکھنا چاہیے۔ اس کے لیے سوچ میں ایک بڑی تبدیلی لازم ہے۔ مسجد کی یہ حیثیت ایک داعی ہی سمجھ سکتا ہے۔ داعی کی نفسیات مسلکی نفسیات سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں مسلکی نفسیات غالب ہے۔ نتیجتاً مساجد بھی مسلکی ہیں۔

عوام اگر سماج اور مسجد کے باہمی تعلق کو جان جائیں تو مساجد کا کردار تبدیل ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں اس تبدیلی کیلئے مزید کتنی محنت کرنا ہو گی۔

انڈونیشیا کے مذہبی ادارے اور قومی مرکزی دھارے میں ان کا کردار

محمد اسرار مدنی[i]

انڈونیشیا کی آزادی کے بعد شروعاتی دنوں میں ہی تعلیمی نظام میں مذہبی عنصر اور تعلیم میں اس کی حیثیت پر گرما گرم بحث چھڑ گئی تھی۔ ڈیڑھ سال کے بحث ومباحثے کے بعد انڈونیشیا کی پارلیمنٹ کو مندرجہ ذیل پالیسی اختیار کی:

"سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم فراہم کی جائے گی، البتہ والدین فیصلہ کریں گے کہ آیا ان کے بچے ان اسباق میں شرکت کریں گے یا نہیں"۔ ظاہر ہے اس شرط کی وجہ یہ تھی کہ ملک میں دیگر مذاہب کے لوگ بھی رہتے ہیں۔

شروع میں مذہبی تعلیم سے متعلقہ ہدایات تعلیمی ایکٹ 1950 کا حصہ تھیں۔ مگر مسلم گروہوں اور وزارت مذہبی امور کی طرف سے دباؤ آیا کہ، اسلامی نظام تعلیم کو مجموعی طور پر تعلیمی ایکٹ 1950 سے خارج کر کے، باقاعدہ اسے وزارت مذہبی امور کے ماتحت کر دیا جائے۔ اس کے بعد تعلیمی نظام سے متعلق عمومی مذہبی ہدایات کو تو ایکٹ میں شامل رکھا گیا، لیکن اسلامی مذہبی ہدایات کو وزارت مذہبی امور کی ذمہ داری کے تحت کر دیا گیا، چاہے یہ اسلامی تعلیم سیکولر اسکولوں میں ہی کیوں نہ فراہم کی جائے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک، سیکولر اسکولوں میں بھی مذہبی تعلیم کی پالیسی کے نفاذ کو وزارت مذہبی امور اور وزارت تعلیم مشترکہ طور پر دیکھتی ہیں۔

---

[i] سربراہ انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور۔ منتظم مذہبی سفارتکاری پروگرام۔

1960 کے بعد انڈونیشیا کے سیاسی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلی آئی، تو اس کے بعد غیر لازمی مذہبی تعلیم کو پہلی جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک، سب کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا۔ 1965 میں بغاوت کی کوشش ہوئی، جس میں کمیونسٹ اور بنیاد پرست قوم پرستوں کو کامیابی نہ مل سکی، اور فوج اور مسلم گروہ مزید مضبوط ہوئے۔ اس سے اسکول کے نصاب میں مذہبی تعلیم کی حیثیت کو پہلے سے بہتر بنانے کا ایک نیا موقع مل گیا۔ تب ملحد کمیونزم کے خلاف جنگ میں مذہب کو ایک اہم عنصر سمجھا جاتا تھا۔ 1966 میں اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ پہلی جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک اسکولوں میں مذہب کو بطور مضمون بنایا جائے۔

1997/98 میں کرپشن، معاشی ابتری اور بے روزگاری کے باعث ملک کے کچھ علاقوں میں سول تنازعات پھوٹ پڑے۔ ان سے متعلق کہا گیا تھا کہ یہ نسلی بنیادوں پر ہونے والے واقعات ہیں، بعض علاقوں میں یہ یا مذہبی تنازعات کی صورت اختیار کر گئے، جیسے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین بدمزگی ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ خود مسلم گروپوں کے اندر بھی تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی، جیسے سامپانگ، مدورا، مشرقی جاوا میں سنی اور شیعہ گروہ مدمقابل تھے۔ مختلف مقامات پر احمدیہ اور مسلم گرہوں میں بھی فسادات ہوئے۔ ان تنازعات کے بعد ملک میں بڑے پیمانے پر سیاسی اصلاحات کی گئیں۔

اس پس منظر میں، انڈونیشیا کے تعلیمی نظام، نصاب، فنڈز کے طریق کار اور انتظامی امور میں بھی اصلاحات کی خواہش سامنے آئی۔ مذہبی تعلیم سے یہ توقعات وابستہ ہو گئیں کہ اسے اب دوہرا کام انجام دینا پڑے گا۔ طالب علموں کو عقائد و اخلاقیات کی تربیت دینے اور قومی طور پر ذمہ دار شہری بننے میں مدد کرنے کے ساتھ، انہیں تکثیریت پسند، مکالمے پر یقین رکھنے والا اور اختلافات کے لیے روادار بنانا ہو گا۔

ان فسادات کے بعد اصل میں لوگ فکر مند ہو گئے تھے، کیونکہ ان میں طالب علموں کی شمولیت بھی تھی۔ تعلیمی اداروں کے نوجوانوں کے درمیان شادی سے پہلے جنسی تعلقات، منشیات استعمال کرنے والوں کی بڑھتی تعداد اور طبقاتی تقسیم جیسے مسائل نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ حکام اور لوگوں نے مذہبی تعلیم کی تاثیر پر سوال اٹھانا شروع کر دیے کہ ان کے بچوں پر دینی تعلیم نے کیا اثرات

مرتب کیے؟ مذہبی تعلیم بچوں کو سماج دشمن سرگرمیوں سے کیوں نہ روک سکی؟ لوگ تعلیمی احتساب کا مطالبہ کرنے لگے۔ مذہبی اساتذہ کو مورالزام ٹھہرایا گیا کہ وہ طالب علموں میں اچھے اخلاق پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ لوگ مذہبی تعلیم سے بہت زیادہ توقع رکھتے ہیں جو طلباء کو کسی بھی غیر سماجی سرگرمیوں سے باز رکھنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

اس کے بعد نصاب میں اصلاحات کے لیے کھل کر باتیں ہونے لگیں اور ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ حکومت اسکولوں کے لیے نیا مذہبی نصاب لائے، جس میں نہ صرف ظاہری معاملات کو درست کرنے پر توجہ دی جائے، بلکہ طلبہ کی شہری اخلاقی تربیت بھی ہو۔ درمیان میں تھوڑی بہت تبدیلیاں آتی رہیں، مگر 2013 میں باقاعدہ ایک تنقیح شدہ مذہبی نصاب متعارف کرایا گیا جسے ''نصاب 2013'' کہا جاتا ہے۔ اس میں مذہبی تعلیم کو اخلاقی تعلیم کے ساتھ ایک مضمون کے طور پر ضم کر دیا گیا ہے جسے 'مذہبی و اخلاقی تعلیم' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح، انڈونیشیا کے قومی شعار پانچاسیلا[ii] (Pancasila) کی تعلیم جو پہلے نصاب سے ختم کر دی گئی تھی اسے بھی واپس بحال کر دیا گیا۔ اس کے بعد انڈونیشین حکومت نے مذہبی اداروں کے نصاب پر بھی توجہ مرکوز کی اور زور دیا کہ اسے شہریوں کے لیے مؤثر بنایا جانا چاہیے۔ اس میں اچھے کردار، علم اور مہارتوں کا عمدہ امتزاج ہونا چاہیے۔

انڈونیشیا کی سب سے بڑی اسلامی جماعت محمدیہ نے اپنے تعلیمی اداروں کے لیے جو نصاب تیار کیا ہے وہ بہت ہی جدید اور کئی خوبیوں کا حامل ہے۔ محمدیہ کا ماڈل جدید تعلیمی نظام کے سیکولر علوم کو مذہبی علوم کے ساتھ جوڑتا ہے تاکہ اسلامی اقدار، انڈونیشیائی عنصر اور جدیدیت کے درمیان فرق کو کم کیا جا سکے۔ محمدیہ کے تعلیمی مفکرین اور ماہرین نے اسلامی اقدار، انڈونیشیائی قومی عنصر اور جدیدیت کو جوڑنے کے لیے مختلف کوششیں کی ہیں۔ ان تینوں ستونوں کو انڈونیشیا کی شناخت کی تشکیل میں

[ii] یہ پانچ اصول ہیں جن پر تمام انڈونیشین یقین رکھتے ہیں: ایک خدا، مہذب انسانیت، ملکی اتحاد، جمہوریت، سماجی انصاف،

بنیادی سمجھا جاتا ہے۔ محمدیہ کے مطابق، تعلیم اس وژن کو حاصل کرنے کا سب سے بہتر اور ممکنہ طریقہ ہے۔ یہ تنظیم انڈونیشیا میں پرامن، اعتدال پسند، اور جمہوری اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے میں پیش پیش ہے۔ حالانکہ یہ ہدف حاصل کرنا بہ ظاہر آسان نہیں تھا۔

دینی اداروں فضلا کی قومی دھارے میں فعالیت

انڈونیشیا میں مذہبی تعلیم اور مدارس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ استعمار سے آزادی سے قبل بھی دینی تعلیم کے ادارے موجود اور متحرک تھے، اور اس کے بعد بھی یہ صورتحال جاری رہی۔ مدارس کو ملک کے اندر کافی مقبولیت ملی ہے، اور کئی سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں نے مدارس کی کوکھ سے جنم لیا۔ مدارس کی ڈگریوں کو حکومتی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے اور ان سے نکلنے والے افراد مرکزی قومی دھارے میں فعال ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے تمام شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ ملک کے بائیں بازو کو اگرچہ ان مدارس پر تحفظات ہیں، کیونکہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کو یہ مدارس بڑی وسیع کمک مہیا کرتے ہیں۔ 1970 کی دہائی میں، انڈونیشیا میں بڑے پیمانے پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کو سیکولر نہج پر غالب کرنے کے لیے سب سے بڑی کوشش کی گئی تھی۔ اس وقت کی حکومت نے 61,000 پبلک پرائمری اسکول بنائے، جن کا مقصد تعلیم کے نظریاتی وزن کو تبدیل کرنا تھا۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ پرائمری سطح پر اتنی بڑی اسکولنگ اور ڈھانچے کو کھڑا کرنے اور مؤثر بنانے کے لیے حکومت کی ساری توجہ محدود ہو گئی اور پرائمری کے بعد کی سطح کی تعلیم میں مدارس پہلے سے زیادہ فعال ہو گئے۔ اس دوران اسلامی شعبہ نہ صرف ریاست کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے نئے مرحلے میں داخل ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ سماجی طلب اور تقاضوں کی بنا پر نئے بنائے گئے اسکولوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک مذہبی نصاب شامل ہوتا گیا۔ تاہم، سیکولر تعلیمی نظام ختم نہیں ہوا ہے، سیکولر تعلیم پبلک کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ اسکول بھی فراہم کرتے ہیں۔ سیکولر ادارے زیادہ تر سرکاری ہیں۔ ملک کے 76 فیصد سیکولر اسکول سرکاری ہیں، جن میں 90 فیصد پرائمری سطح پر اور 50 فیصد ثانوی سطح پر ہیں۔ سیکولر اسکول 1970 کی دہائی سے وزارت تعلیم و ثقافت کی ریگولیٹری اتھارٹی کے

تحت آتے ہیں۔

اسلامی اداروں کی تقسیم

انڈونیشیا میں اسلامی تعلیم فراہم کرنے والے دو طرح کے ادارے ہیں۔ ۱: مدرسہ ، ۲: پیسنٹرن (pesantren)

1- مدارس دن کے اوقات میں کام کرنے والے ایسے ادارے ہیں جو سیکولر اسکولوں کی طرح تدریسی طریقے استعمال کرتے ہیں لیکن اپنے نصاب میں کافی زیادہ مذہبی مواد شامل کرتے ہیں۔

2- پیسنٹرن(pesantren)، رہائشی ادارے ہیں جو اسلامی علوم کی تدریس کے لیے وقف ہیں۔انڈونیشیا میں مدارس کے مقابلے میں پیسنٹرن زیادہ فعال اور سیاسی رجحانات کے حامل ہیں۔ان میں زیادہ تفصیلی طور پہ مذہبی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور حکومت کی طرف سے نگرانی کا پہلو بھی کمزور ہے۔

مذہبی اداروں کی اکثریت نجی طور پر چلائی جاتی ہے۔اس میں تمام پیسنٹرن اور 92 فیصد مدرسے شامل ہیں۔1967 میں، حکومت نے تمام نجی مدرسوں کو ریاست کے زیر انتظام آنے اور اضافی فنڈنگ دینے کی دعوت دی۔ مگر یہ کوشش ناکام ہوگئی کیونکہ زیادہ تر مذہبی اداروں نے نجی رہنے کا انتخاب کیا۔ مذہبی شعبے کی آزادی کو برقرار رکھنے کی شدید خواہش نے انڈونیشیا کے دوہرے تعلیمی نظام کو بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔

سیکولر اور مذہبی اداروں کے درمیان نصاب کا فرق

اسلامی اسکول بہت سے ایسے مذہبی مضامین پڑھاتے ہیں جو سیکولر اسکولوں میں شامل نہیں ہیں۔ان اداروں کے پانچ بنیادی مضامین ہیں: اسلامی قانون (فقہ)، اسلامی نظریہ اور اخلاقیات (عقیدہ اور اخلاق)، قرآن اور حدیث، عربی زبان، اور تاریخ انبیاء (قصہ الانبیاء)۔1950 کی دہائی میں انڈونیشیا

کے تمام اسلامی و سیکولر ادارے لگ بھگ ملتا جلتا نصاب پڑھاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ فرق بڑھتا گیا۔ مثال کے طور پہ، اب سیکولر اداروں میں گریڈ 6 کے طلباء اگر مذہبی تعلیم پر ہر ہفتے کل 2 گھنٹے صرف کرتے ہیں، تو اسلامی اسکولوں کے طلباء مذہبی مضامین پر تدریسی وقت کا 25 سے 40 فیصد تک خرچ کرتے ہیں۔

تعداد اور اخراجات کا فرق

انڈونیشیا کے تمام نجی اسکولوں کا 60 فیصد اسلامی اسکولوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کہ ملک کے آدھے سے زیادہ پرائیویٹ سکول اسلامی ہیں۔ اگرچہ ملک کے کچھ علاقوں میں سیکولر نجی اسکولوں کی طرف رجحان پایا جاتا ہے، مگر ان کا نصاب اور تعلیم کا منہج بالکل الگ ہے۔ پرائمری سطح پر تو ملک میں 43 فیصد اسکول اسلامی ہیں، جبکہ اس کے بعد مڈل اور ثانوی اسکولوں کی سطح پر اسلامی اداروں کا تناسب اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اسلامی اور ریاستی اسکولوں کے مابین تعلیمی اخراجات کا فرق بھی پایا ہے، مگر یہ محدود ہے۔ پرائمری سطح پر، ایک طالب علم کا اسلامی اسکولوں میں تقریباً 20 ڈالر سالانہ خرچ آتا ہے، تو ریاستی اسکولوں کے لیے 21 ڈالر کے اوسط سالانہ اخراجات آتے ہیں۔ مڈل اسکول کی سطح پر، ریاستی اسکولوں میں سالانہ اخراجات اوسطاً 34 ڈالر اور مدرسے میں 29 ڈالر ہیں۔

کتاب: شرعی قوانین کے تناظر میں
سماج سازی: آچے کا تجربہ

محمد اسرار مدنی

Sharia and Social Engineering: Implementation of Islamic Law in Contemporary Aceh, Indonesia

مصنف: مائیکل فینر Michael Feener

انڈونیشیا کا سب سے بڑا صوبہ آچے جو نانگرو، آچے دارالسلام بھی کہلاتا ہے۔ یہ اٹھاون ہزار مربع کلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے- اس میں ایک سو انیس جزیرے ہیں ، بہتر بڑے دریا ہیں اور دو نہایت خوبصورت جھیلیں ہیں۔ آچے انڈونیشیا کا باب الاسلام کہلاتا ہے کیونکہ یہاں آٹھویں صدی میں عرب تاجروں نے مقامی باشندوں کو اسلام سے متعارف کرایا۔ بہت سے عرب تاجر یہیں آباد ہو گئے اور آٹھویں صدی کے آخر میں یہاں پہلی اسلامی سلطنت قائم ہوئی- سترویں صدری میں آچے میں سلطان اسکندر مدا کی سلطنت پورے جنوب مشرقی ایشیا میں طاقتور سلطنت سمجھی جاتی تھی۔ آچے کے عوام نے اپنے وطن کی آزادی کے لئے 1873ء میں ولندیزیوں کے خلاف جنگ شروع کی جو دنیا کی طویل ترین جنگ شمار ہوتی ہے- یہ جنگ 1942ء تک جاری رہی۔ 1945ء میں جب مسلح جدوجہد کے بعد انڈونیشیا ولندیزی غلامی سے آزاد ہوا تو آچے انڈونیشیا کا حصہ بنا لیکن اس کو ملک کا خصوصی خود مختار علاقہ قرار دیا گیا۔

انڈونیشیا کے مغرب میں واقع آچے کو ایک انتہائی مذہبی صوبہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی زیادہ تر آبادی مسلمان ہے اور یہاں کے باشندے شریعت کے رسوم و رواج اور قوانین کے مطابق رہتے ہیں۔ اس

انڈونیشی صوبے میں شرعی قوانین کا نفاذ ہے، جہاں متعدد جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو شرعی سزائیں سنائی جاتی ہیں اور ان سزاؤں پر عملدرآمد لوگوں کے سامنے کھلے عام کیا جاتا ہے۔

حالانکہ انڈونیشیا کی مرکزی حکومت کو آچے کے مکمل شرعی نظام پر کچھ اعتراضات ہیں لیکن اس صوبے کو خود مختاری حاصل ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت زیادہ دخل اندازی نہیں کرتی۔ اس کی وجہ آچے میں علیحدگی کی سوچ کا پایا جانا ہے، جس کے لیے آچے کے عوام ماضی میں کوششیں بھیکرتے رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی مرکزی حکومت اس صوبے میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرتی تاکہ وہاں کے عوام مرکز سے دور نہ ہوں۔ آچے تیل، گیس اور دیگر معدنی ذخائر کے اعتبار سے مالامال علاقہ ہے۔

اگرچہ آچے میں مذہبی تشخص کی طرف رجحان میں اضافہ 2004ء کے سونامی کے بعد ہوا تھا لیکن یہ بنیادی وجہ نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی آچے میں حکومتوں نے اس جانب کئی اقدامات اٹھائے تھے۔ صوبے کی حکومت نے 1965ء میں علماء کو ریاستی ڈھانچے میں شمولیت کی طرف قدم اٹھایا تھا اور مجلس علماء تشکیل دی تھی جو ایک قسم کی شرعی فورس تھی جو ریاست کو شرعی امور میں مشاورت فراہم کرتی اور تجاویز پیش کرتی تھی۔ اسی کو دیکھتے ہوئے بعد میں 1975ء میں صدر سہارتو نے بھی مرکزی سطح پر مجلس علماء انڈونیشیا قائم کی تھی۔ آچے میں مذہبی پولیس کو بھی قانون سازی کے ذریعے ریاستی انتظامیہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ وہاں کی حکومت نے علماء کونسل کی ذمہ داری بنائی ہے کہ وہ اسلام کاری کے عمل میں حکومت کی مدد کرے اور اپنی سفارشات دے۔ اس ضمن میں کونسل کا کردار نمایاں ہے اور وہ اب تک صوبے میں فعال و طاقتور ہے۔

صوبے میں ریاست و مذہب کے مابین تعلق کو باہم مربوط بنانے کے لیے کئی اہم دینی ادارے تشکیل دیے گئے ہیں جو ریاستی مشینری کے ساتھ قانونی حیثیت میں کام کرتے ہیں، ان میں علماء کونسل کے علاوہ، ولایت الحسبہ اور سٹیٹ شریعہ ایجنسی بھی شامل ہیں۔ اس ساری سعی کا مقصد آچے کے سماج کو مذہبی تشخص کے ساتھ ڈھالنا ہے۔

آچے مسلم دنیا کا ایسا علاقہ ہے جہاں اسلامائزیشن سماج کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ آچے میں سن 2005 میں شرعی سزاؤں کا باقاعدہ نفاذ کیا گیا تھا۔

اس صوبے میں جوا، زناکاری، شراب نوشی اور ہم جنس پرستی یا شادی سے قبل سیکس جیسے مروجہ جرائم پر کارروائی شرعی قوانین کے تحت کی جاتی ہے۔

آچے میں ایک سپیشل فورس بھی تشکیل دی گئی ہے، جو مخبری پر چھاپے مارتی ہے اور ان جرائم میں ملوث لوگوں کو گرفتار کر لیتی ہے۔

یہاں خواتین کے لیے حجاب پہننا بھی لازمی ہے۔

اسلامی قواعد کے مطابق ہوٹلوں اور ریستورانوں کے مالکان کو یہ ہدایات بھی جاری کی گئی ہیں کہ وہ ہم جنس پرست افراد اور ٹرانس جینڈرز کو اپنے ہاں ملازمت پر مت رکھیں۔ مزید یہ کہ ایسے مقامات پر نامحرم مردوں کے ہمراہ آنے والی خواتین کو سروسز فراہم نہ کی جائیں اور رات نو بجے کے بعد اکیلی خواتین کو ریستواروں اور کیفے میں داخلے کی اجازت نہ دی جائے۔

حال ہی میں آچے میں انتظامیہ نے ہوائی جہازوں پر خواتین کے عملے کے لیے دوران پرواز اور لینڈنگ کے بعد بھی اسکارف پہننے کا حکم دیا تھا۔

انڈونیشیا کے اس صوبے میں تمام شرعی سزائیں قانونی طور پہ نافذ ہیں۔ حدود وجنایات کے معاملات سے متعلقہ امور میں بھی مکمل شرعی نظام پر عمل کیا جاتا ہے۔

یہ آچے کے مذہبی تشخص کا ایک رخ ہے، جبکہ اس کے ساتھ یہ جاننا اہم ہے کہ اس صوبے میں مذہبی ہم آہنگی بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ وہاں کی حکومت اور مذہبی طبقہ اس بات کو بھی یقینی بناتے ہیں کہ غیر مسلم آبادی کو حقوق کے مسائل نہ ہوں اور انہیں کوئی خطرات لاحق نہ ہوں۔ اس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے بیانات جاری کرتے رہتے ہیں۔ علماء کونسل دہشت گردی اور سخت گیر عناصر کے خلاف بھی کام کرتی ہے اور اس پر عوام کو آگہی دی جاتی

ہے۔اسی طرح کرپشن اور دیگر اخلاقی برائیوں کے خلاف دعوتی واصلاحی بھی کام کیا جاتا ہے۔

انڈونیشیا کے اس صوبے میں مذہبی تشخص کو عام کرنے کے لیے ریاست نے بہت کام کیا ہے۔ یہ تجربہ ریاست ومذہب کے تعلق کے امور میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سود مند ہے۔

انڈونیشیا میں خواتین کی تعلیم: دورۂ انڈونیشیا کے کچھ مشاہدات

حیا حریم[i]

رواں سال انڈونیشیا کے مختلف شہروں میں جانے کا موقع ملا اور متعدد تعلیمی اداروں میں خواتین کے ساتھ ملاقاتیں اور نشستیں رہیں، ان تمام نشستوں میں خواتین کے تعلیمی رجحانات اور میسر وسائل و ماحول کے حوالے سے گفتگو زیرِ بحث رہی۔

انڈونیشیا کے تعلیمی اداروں میں واضح محسوس کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کے حوالے سے مرد و زن کے مابین کوئی صنفی امتیازات نہیں ہیں۔ خواتین کو تمام شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے کے مساوی مواقع اور حقوق حاصل ہیں۔ اس سے زیادہ حیران کن ہے کہ خواتین کے مساوی حقوق اور تعلیم کی فراہمی کے لئے خواتین کی بہت سی جدوجہد کارفرما ہے۔ کچھ سالوں قبل ان خواتین کے مطابق وہ صنفی بے اعتدالی کا شکار رہی ہیں، جس کے نتیجے میں کئی ایسی تحریکیں وجود میں آئیں جنہوں نے خواتین کے حق میں آواز اٹھائی، اور کم عمری کی شادی، خواتین پر گھریلو تشدد اور خواتین کے لئے صنفی امتیازات کے حوالے سے پُر زور احتجاج کیا جو کہ تاحال جاری ہے، البتہ ان تحریکات کے نتیجے میں انڈونیشیا کی خواتین میں شعور آ چکا ہے۔ کسی حد تک وہاں کی عام خواتین میں اپنے حقوق کے حوالے سے آگاہ ہیں۔ مذہبی اعتبار سے انڈونیشیا میں محمدیہ اور نہضۃ العلماء دونوں جماعتیں اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ البتہ جدید اجتہادات اور معاشرتی عرف کو قابلِ قبول بنانے میں نہضۃ العلماء کا بہت کردار ہے۔ انڈونیشیا مشرقی جاوا میں نہضۃ العلماء کا گہرا اثر دیکھا جا سکتا ہے جو کہ انڈونیشیا میں 31 جنوری 1926ء میں قائم ہونے والی، سنی مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے۔ اس کے اراکین کے تعداد 30 ملین سے زائد ہے۔ یہاں کے

[i] حیا حریم، خواتین کے معروف ادارے 'مرکز الحریم' کی سربراہ ہیں۔

مقامی علماء کرام، مدارس اور مذہبی تحریکیں بھی نہضۃ العلماء کے منہج اور فتاوی کو تسلیم کرتی ہیں، اور اسے سرکاری طور پر بھی مقبولیت حاصل ہے۔ان کا ماننا ہے کہ یہ منہج جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ہے اور اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کیسے ہر شخص کو اسلام کے قریب کیا جائے۔

نہضۃ العلماء نے بابِ اجتہاد تک کلی رسائی رکھی ہے اور اسے عُرف کے مطابق بنانے کی کوشش اور اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ان کے مطابق خواتین اس معاشرے کا حصہ ہیں اسی لئے تعلیم، درس گاہ ، تجارت و سیاست میں خواتین کا کردار واضح ہے۔ انڈونیشیا کے مختلف شہروں میں بہت سے ایسے تاریخی مقامات موجود ہیں، جو پڑھی لکھی ایسی خواتین کی یاد میں بنائے گئے ہیں جنہوں نے قوم کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری اٹھائی، عوام ان خواتین سے آج تک عقیدت رکھتی ہے اور انہیں دیگر خواتین کے لئے بطور اسوہ پیش کرتی ہے۔

مختلف شہروں کے مدارس میں جانے سے اندازہ ہوا کہ خواتین دینی تعلیم سمیت دنیاوی علوم و فنون پر بھی دسترس رکھتی ہیں، دینی تعلیم کی تدریس کا آغاز فجر سے پہلے ہو جاتا ہے، قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دن میں انہیں اجازت ہوتی ہے کہ وہ عصری علوم و فنون میں مہارت حاصل کریں۔ یہاں چند شہروں میں تعلیمِ بنات کے حوالے سے اپنا تجزیہ ذکر کروں گی:

جے پارہ:

جے پارہ انڈونیشیا کے صوبے سامارانگ میں واقع ہرا بھرا شہر ہے، اس شہر میں مدرسہ ہاشم الاشعریہ کے نام سے موسوم خواتین کی تعلیم کا ایک بہت بڑا مدرسہ واقع ہے۔ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ سائنس، فزکس، بیالوجی وغیرہ کے علوم لازمی پڑھائے جاتے ہیں۔اس مدرسے میں لائبریری کے ساتھ سائنس لیبارٹری بھی موجود ہے۔ یہاں نہضۃ العلماء کی فکر کی ترویج واشاعت ہوتی ہے۔ماہانہ بنیادوں پر ملک بھر سے خواتین کے اجتماعات اس مدرسے میں کئے جاتے ہیں۔ اس مدرسے میں خواتین کو لکڑی کی صنعت و حرفت سکھائی جاتی ہے۔ یہاں کئی طالبات کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے لکڑی کے فریم اور مختلف نمونے بنا رہیں تھیں۔ یہاں علمی اجتماعات میں جمع ہونے والی خواتین کی

تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے، خواتین کو مختلف جگہوں میں مختلف موضوعات پر علمی حلقات میسر ہوتے ہیں، جس میں اپنی دلچسپی کے موضوعات میں شرکت کر سکتی ہیں، انہیں سوال کرنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔

جگ جا/یوک یکارتہ:

یہ شہر جے پارہ سے چھ گھنٹے کے سفر کی مسافت پر واقع ہے، اس شہر کو تعلیم کا شہر کہا جاتا ہے۔ انڈونیشیا بھر میں پھیلے ہوئی مختلف مذہبی و سماجی شخصیات اسی شہر کے کسی مدرسے میں دینی علوم سے فیضیاب ہو چکی ہیں۔ اس شہر کے ہر محلے میں بے شمار مدارس واقع ہیں، یہاں تک کے شہر "ملانگ" کی ایک گلی میں سولہ مدرسے میں نے خود دیکھے ہیں، جن میں طلباء و طالبات کی تعلیم کا مخلوط ماحول موجود ہے۔ ان کے نزدیک ہر انسان کی اخلاقی تربیت بہت زیادہ ضروری ہے۔ دیگر دنیا کے احوال سے یہ لوگ زیادہ باخبر نہیں ہوتے لیکن ان کے اپنے شہر کے بیشتر افراد اعلی تربیت و اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک مدرسہ تربیت کا نام ہے، جہاں پڑھنے والی ہر طالبہ معاشرے میں بہترین اخلاقی و تربیتی کردار ادا کر سکے۔ اس علاقے کے تمام مدرسوں میں بچے اپنی چار دیواری میں محدود نہیں تھے۔ سب مدرسوں کے بچے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور آنا جانا کرتے ہیں۔ نہوں نے بتایا کہ دو ہزار سولہ میں جاوا میں نہضۃ العلماء نے ایک تحریک چلائی تھی جس کا سلوگن تھا "اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجو" اس تحریک کے بعد بے تحاشا بچوں نے مدارس کا رخ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جاوا انڈونیشیا کے بہت کم بچے ایسے ہوں گے جو مدرسے نہ جاتے ہوں۔

یہاں مدارس کے علاوہ بازاروں اور گلیوں میں موجود مساجد میں خواتین کے لئے تعلیمی حلقات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان حلقات میں مرد و زن کے درمیان موضوعات کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ جو مرد سیکھتے ہیں وہی خواتین کو بھی سکھایا جاتا ہے، میراث و فلکیات جیسے موضوع ہوں یا بیوع و طہارت کے مضامین ہوں، خواتین کے نصاب و دروس میں یکساں شامل ہیں۔

اس شہر میں خواتین کے حقوق کو اجاگر کرنے کی تحریکیں زوروں پر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نہضۃ

العلماء ایسے نصاب کو فروغ دے رہی ہے جس میں خواتین کے مسائل اور ان کا ذکر بھی اسی حد تک ہو جس قدر مردوں کا ذکر شامل ہیں۔ مذہبی خواتین چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان سب کو ہی اپنی مذہبی تعلیم کی مکمل آزادی میسر ہے اور اس پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ مسجد کے پہلو میں چرچ اور دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں موجود ہیں جن سب میں خواتین کی اکثریت نمائندگی کر رہی ہے۔

سامارانگ:

یہ شہر خواتین کی پیشہ ورانہ ترقی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اپنے شہروں سے تعلیم حاصل کرنے والی خواتین عصری تعلیم یا دیگر پیشہ ورانہ امور میں مزید آگے بڑھنے کے لئے اس شہر کا رخ کرتی ہیں۔ یہاں انہیں تجارت و کاروبار کو فروغ دینے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اس شہر کی مختلف درسگاہوں میں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی تربیت ہوتی ہے۔ صوبے کے وزیر اعظم اکثر ایسے اجتماعات میں حاضر ہوتے ہیں اور خواتین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں مزید آگے بڑھنے کی تجاویز سمیت مواقع فراہم کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

بانڈہ آچے:

سماترا آئر لینڈ میں واقع بانڈہ آچے انڈونیشیا کا ساحلی علاقہ کہلاتا ہے۔ اس شہر کو شریعت کے نفاذ کا علم بردار مانا جاتا ہے۔ یہاں خواتین کی دینی تعلیم میں فقہ اور تفسیر کو بطورِ خاص نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہاں خواتین کی تعلیمی درس گاہوں میں فقہ کو اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ خواتین بہت سے مسائل میں اجتہاد کر رہی ہیں اور انہیں عرف کے مطابق اپنا رہی ہیں، فقہ اور شرع کا جاننا سب کے لئے ضروری ہے۔

خواتین کا شعبہء افتاء:

جکارتہ شہر میں گذشتہ دس سالوں سے خواتین کی ایسی تحریکات کام کر رہی ہیں جو خواتین کو فتوی دینے

کی اہلیت کے منصب پر لا سکیں۔ یہاں تک کہ یہ تحریک سرکاری سطح پر منظور کی جاچکی ہے اور گذشتہ پانچ سالوں سے انہیں حکومتی امداد و سرپرستی بھی فراہم ہورہی ہے۔اس تحریک سے وابستہ خواتین مختلف شہروں میں خواتین کے مسائل زیرِ غور لارہی ہیں اور ان کے مطابق جدید اجتہادی فتاوی کا صدور ہورہاہے۔ان کے فتاوی کو اہمیت حاصل ہورہی ہے اور یہ تحریکات دن بدن مقبول عام بھی ہوتی جارہی ہیں۔اب تک ان کی خواتین کی طرف سے تین اہم مسائل پر باقاعدہ فتاوی جاری کئے جاچکے ہیں۔ جن میں جنسی تشدد، کم عمری کی شادی اور موحولیاتی مسائل شامل ہیں۔ان مسائل کی مختلف جہات کاادراک کیاجارہاہے اور باقاعدہ طور پر ایسے نصاب تیار کئے گئے ہیں جو ان مسائل کے حوالے سے آگاہی دیں۔

بچیوں کی ابتدائی تعلیم:

گذشتہ دس سالوں سے بچیوں کو اسکول اور تعلیمی اداروں میں بھیجنے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں کی تعداد 92.7 فیصد ہے۔ جبکہ لڑکیوں کی تعداد 92.8 فیصد ہے۔

علاوہ ازیں ابتدائی تعلیمی اداروں یعنی اسکولوں میں طلباء و طالبات کو مختلف مضامین اختیار کرنے کا موقع دیاجاتاہے، ایک لگا بندھا نصاب سب طلبہ پر لازم نہیں کیاجاتا، بلکہ کچھ مضامین ان کی دلچسپی پر منحصر ہوتے ہیں۔

وزارتِ تعلیم کی جانب سے ماہانہ بنیادوں پر اسکول جانے والے طلبہ و طالبات کے والدین سے مشاورت اور اجلاس ہوتے ہیں، ان کا کہناہے کہ تعلیمی ڈھانچے میں وہی طالبِ علم مکمل آسکتاہے جس کے والدین اس پر بھرپور توجہ دیں

خلاصہ:

انڈونیشیا میں قومی و صوبائی سطح پر خواتین کے حقوق کی بے شمار تنظیموں کی فعالی اور تحریکات کے

کردار، نیز نہضۃ العلماء کی اس میں بھرپور دلچسپی کی بناء پر گذشتہ دس سالوں سے زائد کے عرصے میں یہ خواتین کا تعلیمی رجحان اور شعور واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سرکاری وغیر سرکاری سطح پر خواتین کی نمائندگی تقریباً مساوی ہی ہے، البتہ اس میں ایک خلا یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ عالمی دنیا سے وہاں کے طلبہ وطالبات کا رابطہ بہت ہی کم ہے۔ جس باعث انہیں دیگر ثقافتیں، تہذیبیں اور مذاہب کے نشیب وفراز سے واقفیت بہت ہی کم ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ آٹے میں نمک کے برابر ہے تو یقیناً بے جانہ ہوگا۔ بین الاقوامی علمی دنیا سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں جامعات میں اصل واساس کا کردار ادا کرنے والے مرد وخواتین اساتذہ بھی عربی، انگریزی زبانوں سے ناواقف ہیں۔ دوسری طرف بین الاقوامی اسلامی دنیا کے اہلیان علم، انڈونیشیا کے گہرے اجتہادات، عرف کی چھاپ اور شریعت کی تفہیمات سے متاثر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ جس کے لئے ضرورت ہے کہ انڈونیشیا میں ایسے مقامی افراد وخواتین تیار ہوسکیں جو بین الاقوامی زبانوں میں راہ نمائی وروابط بحال رکھنے میں مدد کرسکیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ کچھ سالوں میں انڈونیشیا عالمی سطح پر روابط بحال کرنے میں مؤثر کردار ادا کرسکے گا۔

کتاب: ملائیشیا اور انڈونیشیا میں ریاست، علماء اور اسلام کا باہمی ربط[i]

(The State, Ulema and Islam in Malaysia and Indonesia)

مصنف: نور شہرل سات NorsharilSaat

تلخیص: ازمل محمد طیب Azmil Muhammad Tayeb

جغرافیائی اعتبار سے انڈونیشیا مسلمانوں کی تعداد ملائیشیا کی مسلم آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ بلکہ انڈونیشیا میں بسنے والے مسلمان پوری دنیا کی مسلم آبادی کا 12 فیصد ہیں۔ اگرچہ انڈونیشیا کے مقابلے میں ملائیشیا کے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن وہاں شرعی قوانین زیادہ مؤثر طریقے سے لاگو کیے گئے ہیں اور سیاسی میدان میں بھی مذہب اور مذہبی حلقے کا اثر ورسوخ زیادہ اور منظم ہے۔ ان دونوں ممالک کی سیاست میں مذہب اور حلقوں کے اثر ورسوخ کو سمجھنے کے لیے ان کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لینا اہم ہے۔

انڈونیشیا میں 99 فیصد آبادی مسلمان عقیدہ کے حامل لوگوں کی ہے، جبکہ ملائیشیا میں مسلمان آبادی 63 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ ملائیشیا میں مسلمان بہت پہلے سے رہ رہے ہیں جبکہ دیگر آبادکاروں کی زیادہ تر تعداد استعماری عہد میں یہاں لائی گئی تھی جب برطانیہ نے چین اور بھارت سے مزدوروں اور کام کرنے والوں کی بڑی تعداد کو یہاں بلایا تھا، یہ لوگ بعد میں ملائیشیا میں ہی رہنے لگے۔ چونکہ ملک میں نئی آنے والی آبادی تعداد میں بڑی تھی اور ان مذہب بھی مختلف تھا تو مقامی لوگوں کے اندر ایک قسم کا عدم تحفظ پیدا ہو گیا، اور ان میں مذہب اور نسل کے حوالے حساسیت پیدا ہو گئی کہ کہیں انہیں خطرات لاحق نہ ہو جائیں۔ اس لیے مذہب اور نسل پسندی کے معاملات ان کی سیاست میں اساسی

[i] یہ مضمون تحقیقات کے شمارے 'مسلم دنیا اور جمہوریت: تحدیات امکانات' میں شائع ہوا۔

حیثیت اختیار کر گئے۔ ملائیشیا میں نسل اور مذہب کے مابین ایک خاص تعلق ہے جو گہرا اور مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملائیشیا میں حکومتوں نے مقامی نسلی عنصر اور مذہب کے درمیان ربط کو مزید گہرا بنانے میں بہت زیادہ کردار ادا کیا اور یہ دونوں چیزیں سیاست میں اہمیت کی حامل رہیں۔

ملائیشیا اور انڈونیشیا کے درمیان سیاست میں مذہبی عنصر کی فعالیت کا یہ مختلف تاریخی و ثقافتی فرق انہیں الگ مقام عطا کرتا ہے۔ ملائیشیا میں مذہبی نیشنل ازم کا پرچار ریاست نے خود کیا ہے۔ یعنی کہ ریاست سیاسی اور اخلاقی دونوں قسم کی اتھارٹی کی حامل رہی ہے۔

نہ صرف یہ کہ ملائیشیا کی سیاست میں مذہبی کا عمل دخل صرف دینی تہذیبی شناخت کو تحفظ دینے کی حد تک محدود رہا ہے، بلکہ اس سے زیادہ وسیع ہے، وہاں مذہبی اقدار کو ترقی اور معاشی بہتری کی ضمانت بھی خیال کیا گیا ہے۔ مہاتیر محمد کے دور حکومت میں مذہب کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ اثر ورسوخ حاصل ہوا اور اس عہد میں معاشی ترقی کو بھی نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ ملائیشیا میں اسلامائزیشن کا عمل دیگر مسلم ممالک کے مقابلے میں زیادہ کامیاب رہا ہے، اور یہ محض عدالتی قوانین تک محدود نہیں بلکہ اس کے اثرات بشمول بیوروکریسی کے ریاست کے سارے انتظامی دھانچے میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

ملائیشیا میں بیوروکریسی انتظامیہ کی اسلامائزیشن میں یونائٹڈ مالے نیشنل آرگنائیزیشن (UMNO) اور ملائیشین اسلامک پارٹی کے مابین مقابلے کی فضا نے بھی کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں مذہبی نقطہ نظر کی حوصلہ افزائی کرنے والی جماعتیں ہیں لیکن ان کے درمیان مذہبی تشریحات کا کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ تاہم اختلاف کے باوجود دونوں جماعتیں اسلامی عنصر کو مضبوط بنانے کا ایجنڈہ رکھتی ہیں، جس سے ملائیشیا میں مذہبی عنصر طاقتور ہوا ہے۔ یونائٹڈ مالے نیشنل آرگنائزیشن ملک کی سب سے قدیم اور زیادہ عرصے تک حکومت کرنے والی جماعت ہے، حالیہ وزیر اعظم اسماعیل صبری یعقوب کا تعلق بھی اسی جماعت کے ساتھ ہے۔ ملائیشین اسلامک پارٹی جسے PAS (Party Islam SE-Malaysia) بھی کہا جاتا ہے 1951ء سے کام کر رہی ہے لیکن 1982ء سے اس نے مذہبی عنصر کو زیادہ ترجیح دی اور اپنی جماعت میں انتخابات کے لیے مذہبی طبقے کو نمائندگی دی۔ یہ جماعت شروع

سے یونائٹڈ مالے کے مقابل رہی ہے۔ لیکن 2019ء میں ان دونوں جماعتوں کے مابین قربت آئی اور دونوں نے ایک دوسرے کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ ان کے رہنماؤں نے ایک متفقہ میثاق نامہ بھی جاری کیا جس میں ان امور کو نمایاں حیثیت حاصل تھی:

- آئینی تقاضوں کا احترام اور تحفظ کیا جائے گا۔
- اسلام کو سیاسی عمل اور ریاستی انتظامیہ میں مرکزی حیثیت حاصل رہے گی۔
- حکومت میں ملائیشیا کی مقامی قیادت کو نمایاں حیثیت حاصل رہے گی۔
- ملاوی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہے گا۔

اگرچہ یہ دونوں جماعتیں ملائیشیا کی دیگر شناختوں اور نسلی گروہوں کے حقوق کے تحفظ کو بھی اہمیت دیتی ہیں اور انہیں حکومتوں میں بھی نمائندگی دی جاتی ہے لیکن جیسا کہ میثاق کی ان چند شقوں سے بھی واضح ہوتا ہے، ملائیشیا کی مرکزی مذہبی سیاسی جماعتیں اسلام اور ملاوی نسلی عنصر کو سیاست میں سب سے اوپر رکھتی ہیں۔

انڈونیشیا میں بھی اسلامی عنصر عام لوگوں کی زندگیوں میں دیکھا جاسکا ہے، اور سیاسی سطح پر بھی مذہبی اثر ورسوخ کم نہیں ہے، لیکن یہاں مذہبی عنصر ریاستی پالیسیوں کا محور نہیں ہے بلکہ یہ مذہبی جماعتوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بالخصوص نہضۃ العلماء اور محمدیہ جیسی جماعتیں اس کے پیچھے ہیں جنہوں نے سماج میں اپنی مقبولیت بنائی ہوئی ہے۔ انہوں نے پورے ملک میں دعوت وتربیہ کے مراکز قائم کیے ہوئے ہیں جو تعلیمی اداروں سمیت زندگی کے باقی شعبوں میں اپنا کام کرتے ہیں۔ ان جماعتوں نے فلاحی کاموں کا ایک وسیع جال بچھایا ہوا ہے جس سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ نہضۃ العلماء اور محمدیہ جیسی جماعتوں نے ملک اپنا تعلق سیاسی جماعتوں کے ساتھ بھی بنایا ہوا ہے اور انتخابات کے وقت وہ رائے عامہ کو بھی ہموار کرتے ہیں، اس لیے ان جماعتوں نے اسلام کا معتدل تصور اپنایا ہوا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ سماج وسیاست میں مذہبی عنصر کے لیے جگہ بنا سکیں۔

انڈونیشیا کی یہ دونوں جماعتیں مسلم دنیا کی سب سے بڑی جماعتیں تصور کی جاتی ہیں۔ صرف نہضۃ

العلماء کے ساتھ انڈونیشیا کے اندر 90 ملین افراد منسلک ہیں، جبکہ انڈونیشیا سے باہر 30 ملین لوگ اس جماعت کے رکن ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے انسلاک کی وجہ سے جماعت کا انتظامی ڈھانچہ بھی وسیع ہے جو مختلف شعبوں کے تحت پھیلا ہوا ہے جن میں صحت، تعلیم، دعوت اور رفاہ و بہبود سے متعلقہ امور شامل ہیں۔ پھر ہر شعبے میں مرکزی رابطہ گاہ کے علاوہ ہر صوبے اور ذیلی سطح پر شہروں و گاؤں میں ان کے دفاتر و مراکز قائم ہیں جو ایک مربوط انداز میں اپنا کام کرتے ہیں۔ بیرون ممالک کے رہائشی کارکنان کے لیے باقاعدہ منظم وِنگ ہیں جو ان سے رابطہ رکھتے ہیں اور ان کے مسائل کے حل میں اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ نہضۃ العلماء اور محمدیہ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے تسلسل کے ساتھ ورکشاپس کا انعقاد کرتی رہتی ہیں اور نوجوانوں کو اپنی عریق تاریخ سے آگاہ کرتی ہیں۔

انڈونیشیا میں ان دونوں جماعتوں کی سربراہی میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جو لوگوں کی صحت کے مسائل میں مدد کرتا ہے۔ اسی طرح سکول سے لے کر یونیورسٹی تک طلبہ کو تعلیمی سہولیات کی فراہمی میں بھی پیش پیش ہیں۔ زرعی شعبوں میں عوام کی رہنمائی اور تعاون کے لیے بھی وِنگ قائم ہیں۔ یہ تمام سہولیات صرف جماعتوں کے ممبران یا کارکنان کے لیے مختص نہیں ہوتیں بلکہ بلا تفریق سب لوگ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

نہضۃ العلماء اور محمدیہ ایک صدی پرانی جماعتیں ہیں۔ یہ نیدرلینڈ سے آزادی سے قبل وجود میں آئیں اور ان کا اساسی ہدف فلاحی کاموں میں انشغال تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ سیاسی معاملات میں بھی رائے دینے لگیں اور اب یہ صورتحال ہے کہ ملک کی حکومتیں بہت سارے معاملات میں ان جماعتوں سے تعاون طلب کرتی ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں آپس میں ایک دوسرے کی حریف بھی سمجھی جاتی ہیں لیکن بنیادی مذہبی معاملات میں ان باہمی ربط بھی بہت گہرا ہے۔ 1937ء میں انہوں نے 'سپریم اسلامک کونسل آف انڈونیشیا' نام کے تحت ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کیا تھا جس کے تحت ملک کے اہم مذہبی معاملات میں رائے پیش کی جاتی ہے جسے عوام میں قبولیت عامہ حاصل ہوتی ہے۔

نہضۃ العلماء نے انڈونیشیا میں پہلے براہ راست سیاست میں بھی حصہ لیا تھا، لیکن بعد میں عدم اطمینان اور فلاحی کاموں کے متاثر ہونے کی وجہ سے براہ راست سیاست سے راہیں جدا کر لیں۔ اس نے سب

سے پہلے 1955ء کے جمہوری انتخابات میں حصہ لیا اور 45 نشستیں حاصل کی تھیں جو مجموعی نشستوں کا 18 فیصد تھیں۔ لیکن 1982ء میں جماعت نے اعلان کیا کہ وہ اپنی مذہبی سماجی خدمات پر توجہ مرکوز رکھے گی۔

انڈونیشیا کے اسلامی تحریکی ورژن کو مسلم دنیا کا سب سے معتدل ورژن کہا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے اس نمونے کے ساتھ مسلمان مذہبی جماعتیں معاشروں میں اپنا اثر ورسوخ وسیع کر سکتی ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ امر ہے کہ کوئی جماعت ایک صدی پرانی ہو لیکن اس کی آب وتاب میں کوئی کمی واقع ہونے کی بجائے اس میں مزید اضافہ ہوتا گیا ہو۔ ورنہ دنیا کی دیگر قدیم مذہبی جماعتیں اپنی فعالیت و مقبولیت کو اس انداز میں آگے نہیں بڑھا سکیں کہ وہ متنازع ہوئے بغیر اب تک دنیا میں ایک ماڈل کے طور پہ دیکھی جاتی ہوں۔ ان دونوں جماعتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے انڈونیشیا کے ثقافتی رنگوں کو مضمحل نہیں ہونے دیا۔ ان کا ہر وہ مقامی ثقافتی حصہ جو اسلامی تعلیمات کے صریحاً خلاف نہ ہو اسے باقی رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پہ انڈونیشین ٹوپی، ٹی شرٹ اور چادر پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ وہاں کی خواتین بھی اپنا ثقافتی مقامی لباس پہنتی ہیں اور اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

انڈونیشیا میں اسلام کے معتدل تصور کے مختلف عوامل بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اس کا جغرافیائی محل وقوع بھی ہے کہ یہ مشرقی سمت میں مسلم دنیا کا دور دراز اور الگ تھلگ ملک ہے جسے پہلے عالمی مسلم مفکرین کی بہت کم توجہ حاصل رہی اور اسے مسلم دنیا کے مسائل میں کم نمائندگی حاصل رہی۔ اس لیے یہاں کے مذہبی عنصر پر مشرق وسطی کے اثرات زیادہ نہیں مرتب ہوئے اور ثقافتی طور پہ یہاں کے مقامی اثرات جیسے تھے ویسے ہی برقرار رہے۔ انڈونیشیا کی اسلامی جماعتوں نے مقامی ثقافت کے تحفظ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ اس ملک کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اسلام کے معتدل تصور کے پھیلاؤ کے لیے بہت پہلے سے ہی کوششیں شروع ہو گئی تھیں، اس ضمن میں صرف نہضۃ العلماء اور محمدیہ جیسی جماعتیں ہی پیش پیش نہیں تھیں بلکہ اور بھی کئی جماعتیں کام کرتی رہی ہیں۔

عبدالرحمان الواحد جو نہضۃ العلماء کے تین بار سربراہ رہے اور ایک بار انڈونیشیا کے صدر بھی منتخب

ہوئے ان کی کتب میں کثرت کے ساتھ ایک اصطلاح ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں مذہبی تشخص کو کس طرح مقامی کلچر کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کی سنجیدہ سعی کی گئی ہے۔ وہ اصطلاح ہے Indigesation of Islam یعنی کہ مذہبی مقامیت پروری۔ یا اسلام کو مقامی تشخص کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سعی۔

اس فکر نے انڈونیشیا کو سیاسی حوالے سے جمہوریت کے قریب رکھا۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ انڈونیشیا میں سہارتو آمریت (1998ء-1968ء) کے دوران جن دو شخصیات نے جمہوریت کی بحالی کے لیے سب سے زیادہ جدوجہد کی وہ نہضۃ العلماء اور محمدیہ کے رہنما تھے۔ عبدالرحمان وحید نہضۃ العلماء سے جبکہ امین رئیس محمدیہ کے رہنما تھے۔ امین رئیس پانچ سال تک People's Consultative Assembly کے چیئرمین بھی رہے جس نے تیس سالہ آمریت کے اختتام کے بعد ملک میں صدر اور نائب صدر کے انتخاب کی ذمہ داری نبھائی اور آئین میں جمہوریت کے حق میں ترامیم متعارف کرائیں۔ عبدالرحمن وحید 1999ء سے 2001ء تک انڈونیشیا کے صدر بھی رہے۔

سہل محفوظ نہضۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے انڈونیشیا کے چوٹی کے عالم کہلائے جاتے تھے اور ان کا ساری جماعتوں میں احترام تھا، انہوں نے سیاست کے اہداف کو بیان کتے ہوئے کہا تھا کہ 'سیاست میں حکومت کا کام سماجی انصاف کو یقینی بنانا، خوشحالی کے لیے سعی کرنا، عالمی امن کے لیے سنجیدگی رکھنا اور مذہبی و نسلی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے'۔ انڈونیشیا میں متعدد ایسی نئی مذہبی جماعتیں وجود میں آئی ہیں جو سخت گیر کہلاتی ہیں، یہ اقلیتوں کے خلاف جذبات کو مہمیز دیتی ہیں، ان میں ایک نمایاں جماعت Defend Islam Movement کے نام سے ہے۔ وہاں حکومتیں ان کے اثرات سے عوام بچانے کے لیے محمدیہ اور نہضۃ العلماء سے تعاون طلب کرتی ہیں۔ انڈونیشیا میں نہضۃ العلماء اور محمدیہ جیسی جماعتوں کا کردار کم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ ایک واضح اور شفاف پالیسی کی حامل جماعتیں ہیں جن کا مقصد ملک میں جمہوری نظم کی حمایت، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، فلاحی کاموں میں انہماک اور عدم برداشت کے خلاف توانا آواز بن کر سامنے آنا ہے۔ یہ ایسے امور ہیں جو

سیاست و سماج کی بہتری کے لیے بنیادی ضرورت ہیں، اور یہ جماعتیں منظم انداز میں اپنے مقاصد کی خاطر کردار ادا کر رہی ہیں۔ اسی لیے ساری دنیا میں انڈونیشیائی مذہبی عنصر کو ایک نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

انڈونیشیا کے ماڈل سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اسلام پسند عناصر کو غیر لبرل اثرات پیدا کرنے کے لیے قومی انتخابات میں فاتح ہونے کی کچھ خاص ضرورت نہیں۔ انڈونیشیا واضح مسلم اکثریت کا حامل سیکیولر شناخت والا ملک ہے اور وہاں عام انتخابات میں مذہبی جماعتوں نے کبھی 8 فیصد سے زائد ووٹ نہیں لیے، مگر مقامی اداروں کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ شریعت کے اصولوں سے مطابقت رکھنے والے 400 سے زائد قانون منظور کیے جا چکے ہیں۔

سفر انڈونیشیا: مذہبی سفار تکاری[i]

مولانا راشد الحق سمیع

انڈونیشین حکومت کی دعوت اور 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کے زیر اہتمام مذہبی سفار تکاری پروگرام کے تحت 28 نومبر تا 12 دسمبر انڈونیشیا کا چودہ روزہ دورے کا موقع ملا۔ ہمارے ساتھ اس دورہ میں پاکستان کے مذہبی و سیاسی جماعتوں کے رہنما، نامور علماء اور ممتاز بین الاقوامی شہرت کے حامل سکالرز کا پندرہ رکنی وفد بھی شامل تھا۔

مذہبی سفار تکاری کے مقاصد کیا ہیں؟ ہم لوگ کیوں گزشتہ پانچ برس سے سفار تکاری کے ذریعے مختلف ممالک اور مختلف پلیٹ فارمز پر جا رہے ہیں؟ دراصل بین الاقوامی میڈیا نے نائن الیون کے بعد اسلام اور مدارس کے خلاف بہت زیادہ پروپیگنڈہ کیا۔ اس زہریلے تاثر کو زائل کرنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر مذہبی سفار تکاری کی ضرورت محسوس کی گئی، تاکہ پاکستان، مسلم اُمہ اور دینی مدارس کا اچھا امیج اجاگر ہو کہ علماء اور مدارس کے نمائندے بھی اپنے علم، اچھے اخلاق اور افکارِ تازہ کے ذریعے بہترین سفار تکاری اور ٹھوس مقاصد بھی حاصل کر سکتے ہیں، جس طرح بیک ڈور ڈپلومیسی، کرکٹ ڈپلومیسی، پبلک ڈپلومیسی اور آرٹس ڈپلومیسی کی جاتی ہے تو اسی طرح مذہبی سفار تکاری بھی کی جا سکتی ہے۔ ہم نے جاپان، چین اور انڈونیشیا جیسی بڑی اقوام کو دینی مدارس، نصاب تعلیم اور مذہبی تنظیموں کی سیاسی کارکردگی سے انہیں متعارف کرایا اور بڑے عالمی پلیٹ فارمز پر اپنا ایجنڈا پیش کرنے کا موقع ملا جسے وہاں کے میڈیا، قومی اخبارات اور ٹی وی چینلز نے مثبت انداز میں اپنے عوام کے سامنے پیش

---

[i] مولانا راشد الحق سمیع ماہنامہ الحق کے مدیر اور جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے سربراہ ہیں۔ یہ اداریہ ماہنامہ الحق، دسمبر 2023 میں شائع ہوا۔

کیااور وہاں کے مختلف دینی مدارس اور اسلامی تنظیموں کے اشتراک عمل اور معادلوں پر کامیاب بات چیت ہوئی۔

دارالعلوم حقانیہ کے ایک نوجوان فاضل مولانا محمد اسرار مدنی بہ قول خورشید ندیم کہ 'سفارتکاری کے نئے افق تلاش کردیے ہیں'۔یعنی علما اگر دیگر شعبوں میں بھی آئیں گے تو وہ دیگر میڈانوں میں بھی بہت کامیاب ہو سکتے ہیں۔الحمدللہ دارالعولم حقانیہ کی عظمت اس کے کارنامے اور حضرت والد صاحب شہید کا نام ہر ملک اور ہر پلیٹ فارم پر پہلے سے متعارف تھااور ہر جگہ مجھے اس کی وجہ سے بہت عزت افزائی سے نوازا گیا۔خصوصا امارت اسلامیہ افغانستان کے حوالے سے بھی لوگ کافی مشتاق تھے، تعلیمی اداروں میں دارالعولم حقانیہ پہلے سے متعارف تھا۔حضرت والد صاحب کی شہادت کے بعد بیرون ملک کے وفود اور اسلام آباد میں متعین سفارتخانوں کے نمائندے اور سفیر مسلسل دارالعولم حقانیہ تشریف لاتے رہتے ہیں اور میرے ان اسفار کی وجہ سے مزید ان پر دارالعلوم حقانیہ کی خدمات واضح ہو رہی ہیں۔الحمدللہ یہ سب کچھ حضرت والد صاحب کی تربیت اور انہی کے فیض کا نتیجہ ہے جو مختلف سلسلوں کی صورت میں آج بھی جاری وساری ہے۔

انڈونیشیا کے دورے میں جن سرکردہ شخصیات سے ملاقاتیں رہیں ان میں نائب وزیر خارجہ Siti Nugraha Mauludiah،انڈونیشیا کی سب سے بڑی مؤثر مذہبی تنظیم نہضۃ العلما کے سربراہ Yahya Cholil Staquf، جامعہ الصدیقیہ کے متہم احمد محروس سکندر، جامعہ محمد کے شیخ شافعی، نائب وزیر مذہبی امور سیف الرحمت بسوقی، ڈائریکٹر اوقاف، انڈونیشین گرینڈرا پارٹی، پارلیمانی کمیٹی برائے دفاع وخارجہ کے رکن ڈاکٹر فضلی زون، پارلیمانی کمیٹی کے نائب چیئرمین رکن صنعت وسرمایہ کاری اور جسٹس پارٹی کے رکن ڈاکٹر سوکامت سمیت دیگر اراکین پارلیمنٹ اور وزراء شامل تھے۔infid انڈونیشیا کی سول سوسائٹی اور خواتین تنظیموں کے ساتھ مکالمہ بھی ہوا۔انڈونیشیا میں متعین پاکستانی سفیر جناب امیر خرم راٹھور صاحب بھی وفد کی خدمت میں پیش پیش رہے اور سفارتخانے میں ایک پر تکلف عشائیہ بھی مہمانوں کے اعزاز میں دیا۔

ہمارے اس وفد میں جناب خورشید ندیم (چیئرمین رحمت للعالمین وخاتم النبیین اتھارٹی)، برادرم

جناب اسرار مدنی (سربراہ انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور)، شیخ القرآن مولانا محمد طیب طاہری (امیر اشاعت التوحید)، بیرسٹر ظفر اللہ خان (سابق وزیر قانون)، مفتی نعمان نعیم (مہتمم جامعہ بنوریہ)، راقم راشد الحق سمیع (مدیر اعلی ماہنامہ الحق و نگران دارالعلوم حقانیہ)، جناب ملک حبیب اورکزئی (چیئرمین پاکستان ریڈ کریسنٹ سوسائٹی)، جناب مجتبی راٹھور، محترمہ ڈاکٹر فرخندہ منصور، محترمہ بینش عرفان، جناب اسماعیل خان، جناب رشاد بخاری صاحبان سمیت انڈونیشین سفارتکار جناب رحمت اور جناب ذوالفقار اور جناب ایکسل مرزا صاحبان شامل تھے۔ جکارتہ میں ہمارے وفد کی میزبانی انڈونیشین حکومت نے سرانجام دی، اسلام آباد میں مقیم سفارتخانے کے سینئر سفارتکار بھی ہمارے ساتھ اس سفر میں بہ طور پروٹوکول آفیسر شامل تھے۔ وہاں پر حکومتی داروں ، دینی مدارس، دینی و تعلیمی رفاہی تنظیموں، انڈونیشیا کی عظیم تاریخی مساجد کے ائمہ اور مختلف تنظیموں کے سربراہوں اور حکومتی وزرا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پروگرام کے اختتام پر ہمارا وفد چار دسمبر کو پاکستان واپس آیا لیکن راقم نے وہاں کے مختلف تاریخی مقامات اور دنیا کے خوبصورت منفرد جزائر کو دیکھنے کے لیے ایک ہفتہ مزید رکنے کا ارادہ کیا۔ عالم اسلام کے اس سب سے بڑی آبادی والے ملک انڈونیشیا کے جغرافیے، وہاں کے مسلمانوں کے تفصیلی حالات اور تہذیب و ثقافت کو ان دو ہفتوں میں بہت قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اس موقع پر برادر جناب محمد اسرار مدنی کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی محبت، اخلاص اور اصرار کے باعث یہ سفر ممکن ہو سکا۔

انڈونیشیا وفد کے شرکاء

- خورشید ندیم (چیئرمین رحمت للعالمین و خاتم النبیین اتھارٹی)
- بیرسٹر ظفر اللہ خان (سابق وزیر قانون)
- شیخ القرآن مولانا محمد طیب طاہری (امیر اشاعت التوحید)
- مولانا راشد الحق سمیع (مدیر اعلیٰ ماہنامہ الحق و نگران دار العلوم حقانیہ)
- مفتی نعمان نعیم (مہتمم جامعہ بنوریہ)
- بیرسٹر محمد علی خان سیف (سابق سینیٹر اور وفاقی وزیر برائے سیاحت و امورِ نوجوانان)
- محمد اسرار مدنی (سربراہ انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور)
- ملک حبیب اورکزئی (چیئرمین پاکستان ریڈ کریسنٹ سوسائٹی)
- اسماعیل خان (بین الاقوامی تعلقات کے ماہر)
- ڈاکٹر فرخندہ منصور (سابق ڈائریکٹر شریعہ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد)
- رشاد بخاری (ڈائریکٹر انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور)
- مجتبیٰ راٹھور (مصنف و سابق مدیر مجلہ تجزیات)
- بینش عرفان (سماجی کارکن)
- رحمت مرزا (انڈونیشیا ایمبیسی اسلام آباد)
- ایکسل میرزا (انڈونیشیا ایمبیسی اسلام آباد)
- ذوالفقار (انڈونیشیا ایمبیسی اسلام آباد)

انڈونیشیا دورے سے کچھ تصاویر

بندونگ کانفرنس منعقدہ 1955 کے تاریخی ہال میں گروپ فوٹو

جکارتہ کے کیتھیڈریل چرچ میں گروپ فوٹو

انڈونیشیا کی نائب وزیر خارجہ مس سیٹی نگ راہا مولدین کیساتھ گروپ فوٹو

اسلام آباد ائیر پورٹ پر روانگی سے پہلے

جکارتہ پارلیمنٹ میں میٹنگ کے بعد ڈپٹی سپیکر اور دیگر اراکین پارلیمنٹ کے ساتھ گروپ فوٹو

نہضۃ العلما کے سربراہ کو اپنی کتاب اسلام اور جمہوریت پیش کرتے ہوئے۔

Islam in Indonesia

Journey from Religious Interpretation to Social Reconstruction

With 88% of its 276m citizens being Muslim, Indonesia is the largest Muslim-majority country and the third largest democracy in the world. For the past two decades, it has enjoyed free and fair elections.

More than half of the population is affiliated with one of two organizations, Nahdlatul Ulama (NU) and Muhammadiyah.

IRCRA organized a series of dialogues on democratic transition and religious freedom in the Muslim World and exchange visits under a religious diplomacy program to understand the active participation of women in the democratic process, a positive and objective approach regarding religious inclusion, social cohesion, human rights, and development. The shining models of Muslim democracies like Indonesia need to be studied. It is very important for countries like Pakistan & South Asia to be on the right track of democracy by learning lessons from the growing democracies in Muslim-majority countries for a prosperous and peaceful future.

This book articles will provide a brief overview of Indonesian Islam and the transformative history of religion and state in East Asia.

***

ہماری مطبوعات

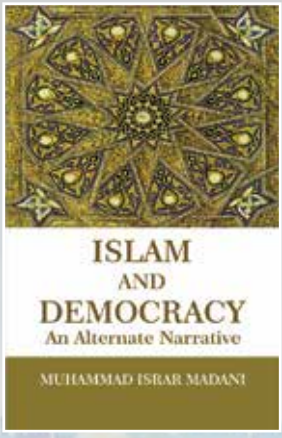

VISIT OUR WEBSITE

تحقیقات
TAHQIQAAT.PK